دانائے راز



مقبول اکیڈمی لاہور

دانائے راز

دانائے راز

واجد رضوی

○

مقبول اکیڈمی
ادبی مارکیٹ — چوک انارکلی — لاہور

طبع اوّل ـــــــــــ ۱۹۶۷ء

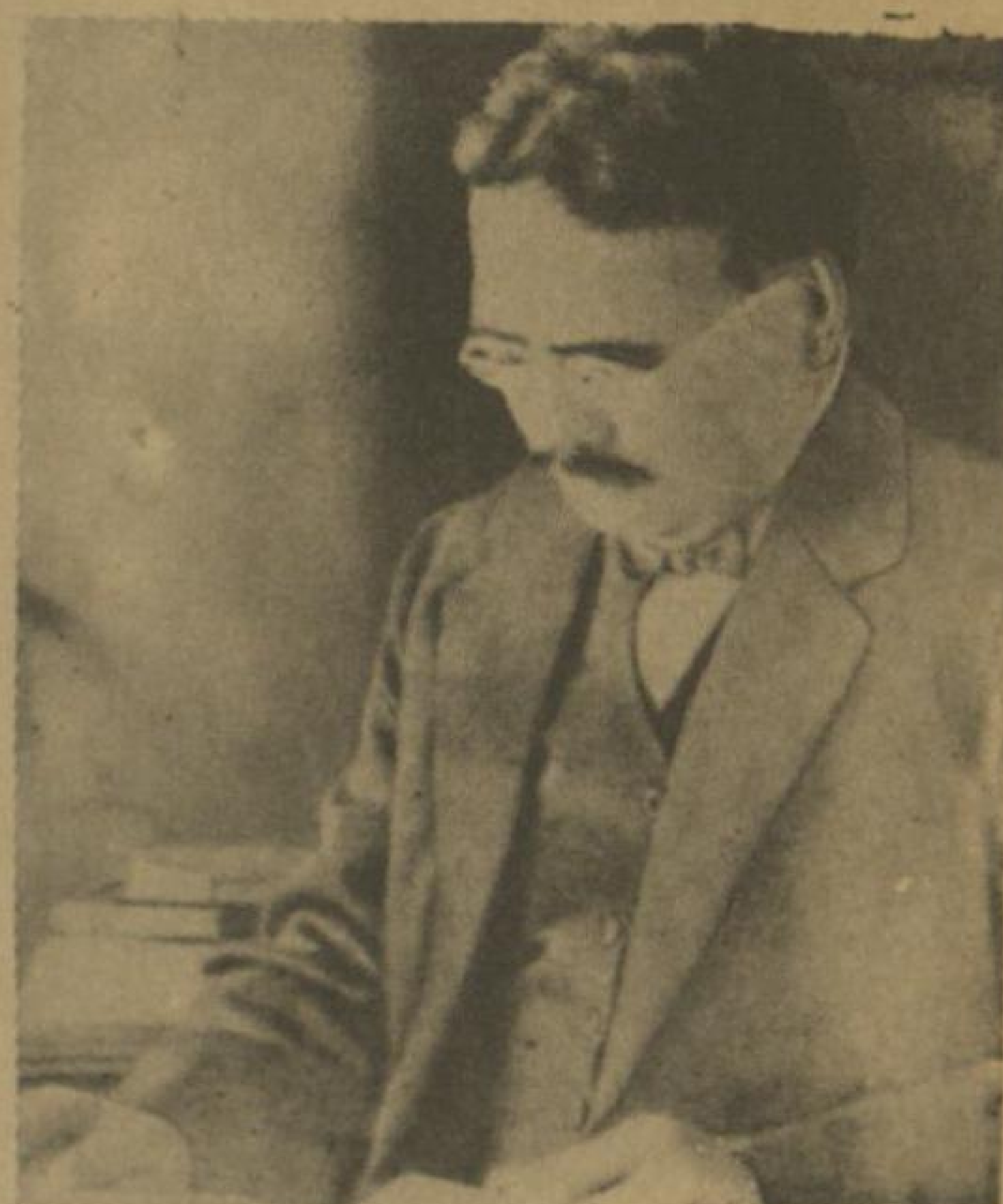
طبع دوم ـــــــــــ ۱۹۶۹ء

طابع ـــــــــــ ملک مقبول احمد

مطبع ـــــــــــ الارشاد پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت ـــــــــــ ۱۸ روپے

مقبول اکیڈمی، لاہور



سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید

نسیمے از حجاز آید کہ ناید

سر آمد روزگارے ایں فقیرے

دگر دانائے راز آید کہ ناید

انتساب

والدہ مرحومہ

سیّدہ ظہیر النساء بیگم

کے نام

جو میری نگاہ سے اوجھل لیکن میرے دل کی

گہرائیوں میں موجود ہیں!

واحد رضوی

عرضِ ناشر

یہ کتاب واجد رضوی کی چار غیر تحریری[1] تقریروں اور چار مضامین پر مشتمل ہے۔

غیر تحریری تقریریں یومِ اقبال کے مواقع پر کی گئی ہیں جنھیں ٹیپ ریکارڈس سے حاصل کر کے اشاعت کی اغراض کے لئے اُن میں ضروری ترمیمیں کر دی گئی ہیں۔ دیگر مضامین اقبالؒ سے محبت اور اُن کی تعلیمات کی اہمیت کے مدِّنظر لکھے گئے ہیں۔

ملک مقبول احمد

---

[1] "اقبال بارگاہِ ایزدی میں"، "اقبال اور کشمکش و انقلاب"، "اقبال کا تصورِ عشق"، اور "آنچناں زہرے . . . ."

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

فہرست مضامین

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

پیش لفظ

بڑے لوگوں کی ارضی موت دراصل اُن کی بقائے دوام کے ارتقائی مدارج کا پہلا زینہ ہوتی ہے۔ اُن کی اپنی زندگی میں اُن کے ساتھی اُن کے کلام اور بیان کو محدود زاویوں میں دیکھتے ہیں۔ مگر ایک دفعہ جب یہ سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے اور ذہن کو ایک جھٹکا سا لگتا ہے کہ پھر کبھی مرنے والے سے تبادلۂ خیال ممکن نہیں تو مجبوراً اُس کے چھوڑے ہوئے ورثہ کا رُخ کرنا پڑتا ہے تاکہ اس کی ذات سے نہیں تو کم از کم صفات ہی سے آشنائی باقی رہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ صفات و کلام کا یہ مطالعہ بلا ارادہ اُس کی ذات سے قریب تر کر دیتا ہے۔ علامہ اقبالؒ بھی اُن بڑے لوگوں میں سے ہیں جنھیں زندگی میں معدودے چند افراد نے پورے طریقہ سے سمجھا تھا۔ مگر اب اُن کے کلام کا مطالعہ کرنے والوں کی تعداد لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ضرور ہے۔ برِّصغیر ہند و پاکستان میں بیسیوں مجلسیں اور انجمنیں اُن کے کلام کا پرچار کر رہی ہیں۔ اقبالؒ اس معنی میں خوش قسمت ہیں کہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ نہ صرف اپنوں اور بیگانوں میں اُن کے پڑھنے اور سمجھنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے بلکہ غیر زبانوں مثلاً انگریزی، جرمنی، فرانسیسی، عربی، اطالوی، انڈونیشیائی میں بھی اُن کے

کلام کے ترجمے کیئے جا چکے ہیں۔

نوجوانوں کو اُن کے کلام سے ایک والہانہ دلچسپی سی پیدا ہوتی جا رہی ہے جو قوم کے لیئے ایک شگونِ نیک ہے کیونکہ درحقیقت علامہ اقبالؒ کا کلام قرآنی تعلیمات پر مبنی ہے۔ اور اِن کے کلام کو سمجھنا قرآن کی تعلیمات کو سمجھنے کے مترادف ہے۔

اقبالؒ کے کلام میں ایک خاص پیغام ہے جس کو وہ تمام انسانوں اور بالخصوص مسلمانوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ اب یہ ہمارا اور آنیوالی نسلوں کا فرض ہے کہ اُن کی یہ امانت دوسروں تک پہنچا دیں۔ اگر دو ہزار برس پُرانے پتھر کے کتبے آج بھی شائقین کو تہذیب و وحدانیت کا وہ سبق یاد دلا سکتے ہیں جس کا پرچار مہاتما بدھ نے کیا تھا تو کیا عجب ہے کہ کچھ عرصہ بعد اقبالؒ کے شیدائی چار دانگِ عالم میں اقبال کے کلام کو لوگوں کے دلوں پر نقش کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

واجد رضوی صاحب نے اس کتاب میں اقبال کے کلام کے مختلف پہلوؤں اور مختلف موضوعات پر قلم اُٹھا کر دُنیائے اقبال کے لیئے ایک بڑا حسین گلدستہ تیار کیا ہے۔ یہ موضوعات نہ صرف بین الاسلامی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ اُن میں سے اکثر بین الاقوامی اہمیت اختیار کر چکے ہیں۔ اِن عنوانات پر واجد صاحب سے پہلے لوگوں نے بھی اپنے خیالات پیش کئے ہیں۔ لیکن واجد صاحب نے اقبالؒ کے افکار کا موازنہ مشرق اور مغرب کے متعدد مفکرین کے خیالات کے ساتھ کر کے اپنی تصنیف میں امتیازی کیفیت پیدا کی ہے۔ کچھ عرصہ پیشتر خود راقم الحروف نے ایک مضمون بعنوان اقبال حضورِ باری میں لکھا تھا۔ اِسی طرح اقبال اور فلسفۂ خودی پر ڈاکٹر میر ولی الدین نے، اقبال اور آرٹ پر ڈاکٹر یوسف حسین خان نے،

اقبال کے تصورِ عشق پر ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم نے مضامین لکھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبالؒ کو سمجھنے اور سمجھانے والوں کے لئے اَب چند ایک بڑی بڑی سرخیاں متعین ہو چکی ہیں اور جب تک ہماری زندگی کی اقدار نہ بدلیں گی ہر دور میں مصنف بار بار انہی سرخیوں پر خامہ فرسائی کرتے رہیں گے۔ لیکن اقبال کے کلام کا تنوع کچھ ایسا ہے کہ ہر لکھنے والے کا نقطۂ نظر جُداگانہ ہوتا ہے۔ اور مضامین کی یہ تکرار ناخوشگوار نہیں ہوتی۔ واجد رضوی صاحب کی تصنیف میں یہ موضوعات بھی شامل ہیں اور اُنھوں نے نہایت دلکش زبان میں اقبال کے خیالات اور احساسات کو بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے۔ موصوف جامعہ عثمانیہ کے طالبِ علم اور حیدر آباد دکن کے ایسے دور کی پیداوار ہیں جب وہاں مسلمانوں کی سیاسی کشمکش عروج کو پہنچی ہوئی تھی۔ آپ کی دوسری تصنیفات اور خاصکر "مجاہد اعظم" کے مطالعہ سے اس سیاسی کشمکش کا پوری طرح اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس زمانہ میں جامعہ عثمانیہ کی بدولت مسلمان نوجوانوں میں شعور اور بیداری پیدا ہو چکی تھی۔ واجد رضوی صاحب کے لئے اقبالؒ کے کلام کا سیاسی پس منظر ترک و تاز کا بہترین میدان تھا اور اِس لئے اُسی زمانہ سے وہ اقبال کے مداحوں میں شمار کئے جاتے تھے۔

کتاب کے پہلے مضمون "اقبال بارگاہِ ایزدی میں" میں مصنف نے اقبال کے ذہنی ارتقاء کے ایک خاص پہلو کو لیا ہے۔ ابتداءً شاعر کہتا ہے کہ خُدا سراسر حُسن ہے۔ مگر حُسن تو زوال پذیر ہے۔ پھر اُس کا دوسرا دور "مطلق العنو" کے لباس میں ہے۔ اور شاعر کے نزدیک اس تک پہنچ کر اپنے وجود کو الگ رکھنا انسانیت کی معراج ہے۔ آخری دَور وہ ہے جس میں شاعر پردۂ فطرت

چاک کر کے جمالِ یار کو روبرو بیباکانہ دیکھنا ہے۔ اور مصنوعی تکلّفات کو برطرف کر کے "یزداں بکمند آور" کا والہانہ نعرہ لگاتا ہے۔ احقاقِ حق کا یہ درجہ شاید ہی کسی اور شاعر کو نصیب ہوا ہو۔ واجد صاحب کے اس مضمون میں شاعر کی خدا کو محنت و کلفتِ خدائی سے چندے سینۂ آدم میں دم لینے کی دعوت مولانائے رومی کے اُس چرواہے کے احساسات سے ملتی جلتی ہے جس نے خدا کو اپنے پاس آکر آرام لینے کی دعوت دی تھی۔ "اقبال اور کشمکشِ انقلاب" میں واجد صاحب نے بتایا ہے کہ شاعر اپنے کلام کے ذریعے "زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ ستیز" کی دعوت دیتا ہے اور اس کے نزدیک "روحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب" کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور اُس کی رائے میں انسان خوفِ مرگ پر غلبہ پاکر ہی حیاتِ جاوداں حاصل کر لیتا ہے۔ اقبال اور آرٹ میں مصنف نے شاعر کا نقطۂ نظر واضح کیا ہے کہ آرٹ اس وقت تک آرٹ نہیں جب تک اس کا ایک خاص مقصد نہ ہو۔ اِس کے نزدیک شاعری ایک ذریعہ ہے جسے اپنے فلسفۂ افکار اور تصوّرات کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اقبال کے فلسفۂ خودی میں واجد صاحب بتاتے ہیں کہ خودی ایک لازوال حقیقت ہوتی ہے۔ اور اس کی معراج مردِ کامل کی تخلیق ہے۔

اقبال کے فلسفۂ بیخودی، —— اور عشق کے مضامین بھی بڑی محنت سے مرتب کئے گئے ہیں۔ آخری مضمون "اقبال بارگاہِ رسالت مآب میں" واجد صاحب کا خاص مضمون ہے۔ جہاں حضورِ حق میں جسارت اور ناز و نیاز ہے وہاں بارگاہِ نبوتؐ میں صرف عقیدت، اعترافِ عظمت اور نورِ رسالتؐ سے فیضیابی کا اشتیاق ہے۔ "دانائے راز" خیالات کی سلجھی ہوئی ترتیب اور اندازِ بیان کی دلکشی

کا ایک خوبصورت مرقع ہے۔ مجھے یقین ہے کہ واجد رضوی صاحب کی یہ تصنیف جسے اُنھوں نے نہایت عقیدت اور محنت کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اہلِ ذوق کی توجہ اور بغور مطالعہ کی مستحق ہوگی۔ میں مصنف کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ ان کی کوششوں سے اقبالیات میں ایک قابلِ قدر تصنیف کا اضافہ ہوا ہے۔

ڈاکٹر محمدؐ رضی الدین صدیقی

(وائس چانسلر)

اقبالؔ بارگاہِ ایزدی میں

انسان اپنے گرد وپیش پر نظر ڈالتا ہے ، چمکتے سورج ، درخشاں تاروں اور نیلگوں آسمانوں پر غور کرتا ہے ، دامنِ کہسار میں جھومتی ہوئی مست گھٹاؤں کو دیکھتا ہے ، سبزہ و گُل کی رعنائیوں سے متاثر ہوتا ہے ، اور مہوشوں کی شوخیوں سے جب اس کا دل دھڑکنے لگتا ہے تو وہ پکار اُٹھتا ہے کہ !-

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے!
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں! عشوہ و غمزہ و ادا کیا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقبالؔ بارگاہِ ایزدی میں

اِس حیرت خانۂ عالم کی ابتداء اور انتہاء کو سمجھنے اور اِس کے بنانے والے کو تلاش کرنے کا سلسلہ ازل سے جاری ہے۔ یہہ جستجو انسان کے لئے فطری ہے۔ یہ تلاش دراصل انسانیت کا جوہر ہے۔ انسان اپنے گردوپیش پر نظر ڈالتا ہے۔ چمکتے سورج، درخشاں تاروں اور نیلگوں آسمانوں پر غور کرتا ہے، دامنِ کہسار میں جھومتی ہوئی مست گھٹاؤں کو دیکھتا ہے، سبزہ و گل کی رعنائیوں سے متاثر ہوتا ہے اور مہوشوں کی شوخیوں سے جب اُس کا دِل دھڑکنے لگتا ہے تو وہ پکار اُٹھتا ہے کہ:-

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ عشوہ و غمزہ و ادا کیا ہے؟

انسان کا یہ سوزِ دروں طوفان خیز موجوں کی طرح اُمڈتا چلا آتا ہے۔ کائنات کے مظاہر — ثریاؔ کی بلندی، کہکشاں کی خوبصورتی — اِس تلاطم میں اضافہ ہی کرتے رہتے ہیں اور ذرہؔ ذرہؔ میں فراق کی اِس گرمی کو، تلاش کی اِسی آگ کو، تمنّاؔ کے اِسی سوز کو وہ محسوس کرتا رہتا ہے۔!

درونِ سینۂ ماسوزِ آرزو زکجاست؟ سبوزِ ماست ولے بادہ درسبوز کجاست!

گرفتم ایں کہ جہاں خاک و ما کفِ خاکیم — بہ ذرّہ ذرّہ ما دردِ جستجو ز کجاست؟
نگاہِ ما بگریبانِ کہکشاں افتد — جنونِ ما ز کجا شورِ ہائے و ہو ز کجاست؟

اور تختۂ گلہائے رنگ رنگ میں، پھولوں کی نازک پنکھڑیوں میں، اُن کے کانٹوں کی چبھن میں، مرغانِ چمن کی ہنگامہ آرائیوں میں وہ اسی کیفیت کو پاتا ہے کہ —

گُل گفت کہ ہنگامۂ مرغانِ چمن چیست؟ — ایں انجمن آراستہ بالائے شجر چیست؟

ایں زیر و زبر چیست؟

پایانِ نظر چیست؟

خارِ گُلِ تر چیست؟

تو کیستی و من کیَم ایں صحبتِ ما چیست؟ — بر شاخِ من ایں طائرکِ نغمہ سرا چیست؟

مقصودِ نوا چیست؟

مطلوبِ صبا چیست؟

ایں کہنہ سرا چیست؟

اور پھر دوسری طرف زندگی کا کیف اُس کی اِس محویت کو عمیق تر کر دیتا ہے فطرت کا ترنّم اُس کے تصوّرات میں رنگ بھرنے لگتا ہے اور ساز سے نکلے ہوئے نغموں سے اس کی روح بیتاب ہو کر اپنے معشوقِ حقیقی کی تلاش شروع کر دیتی ہے۔

خشک مغز و خشک تار و خشک پوست

رباب کیا ہے؟ اِس کی لکڑی بھی خشک ہے، تار بھی خشک اور اِس پہ لگا ہُوا چمڑا بھی خشک! — تو پھر

از کجا می آید ایں آوازِ دوست! — (رومی)

دوست کی آواز پھر کہاں سے آرہی ہے — ! تشویش بڑھتی جاتی ہے، تشنگی شدید تر ہوتی جاتی ہے اور اس دلبرِ عشوہ طراز کی جستجو میں نوعِ انسان کے قافلے یکے بعد دیگرے دیوانہ وار رواں ہو جاتے ہیں! — تلاش کا سلسلہ جاری رہتا ہے لیکن کہیں خیالی اور مادی تشبیہوں اور تمثیلوں میں اسے اسیر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اِن کیفیتوں کو بتوں کی صورت میں پیش کر کے سکونِ قلب کا سامان مہیّا کیا جاتا ہے اور کہیں نسائیت کی نزاکت اور عظمت کے مدِّنظر اسے ماتا کا روپ دیا جاتا ہے۔ رومیوں اور یونانیوں کے ہاں بھی خدا عورت ہی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن بابل اور شام کی طرح جہاں مرد کا تصوّر فوقیّت رکھتا ہے وہاں خدا مرد کی صورت میں جلوہ نُما ہوتا ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل میں اسے شوہر کا درجہ دیا جاتا ہے تو عیسائیوں کے ہاں اسے شفیق باپ سمجھا جانے لگتا ہے — ! اور پھر اسلام خدائے لاشریک کا ایک نورانی تصوّر پیش کرتا ہے اور انسان کے طریقۂ فکر کو ہمدوشِ ثریّا کر دیتا ہے — لیکن امتدادِ زمانہ سے اس پاکیزہ تعلیم پر ویدانتی اور نو افلاطونی تخیّل کا زنگ چڑھنا شروع ہوتا ہے۔ اور یہ روشن تصوّر پست افکار کی تاریک گھٹاؤں میں چھپنے لگتا ہے۔ تاہم دیر و حرم کے ہنگامے جاری رہتے ہیں۔

گہے از سنگ تصویرش تراشیم　　　گہے نادیدہ بروے سجدہ پاشیم

بت تراشی اور سجدہ ریزی کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ عہدِ حاضر میں مادّہ خدا کی جگہ لے لیتا ہے۔ اس کی ظاہری کرشمہ سازیوں سے انسان کی نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور مادیت کی شرابِ دوآتشہ سے وہ مخمور ہو جاتا ہے — لیکن دوست کی آواز اپنی جگہ قائم رہتی ہے، دوست کی وہ آواز جس پر انسانوں کے

قافلے گریباں چاک کر کے نکل کھڑے ہوئے تھے بدستور فضائے بسیط میں گونجتی رہتی ہے اور انسان کے لئے ایک سربستہ راز بنی رہتی ہے — یہاں تک کہ پردۂ غیب سے ایک دانائے راز، — قرآنی تجلیاتؐ کو بے نقاب کئے ہوئے باہر آتا ہے اور زیرِ لب گنگنانے لگتا ہے کہ :۔

دورِ حاضر مستِ چنگ و بے سرور — بے ثبات و بے یقین و بے حضور

کیا خبر اس کو کہ ہے یہ راز کیا — دوست کیا ہے، دوست کی آواز کیا

اپنے ذہنِ رسا کی وجہ سے اور اپنی مخصوص تربیت کے سبب سے اقبال ابتداء ہی سے موحد ہیں۔ وہ خدا کے وجود کو ابتداء ہی سے مانتے ہیں اور اُس کے جلال و جبروت کے قائل ہیں۔ گویا کہ وہ بارگاہِ ایزدی میں اپنے سنِ شعور ہی سے پہنچ جاتے ہیں — لیکن اس نورِ کامل اور تجلّیِ مطلق کے سامنے ان کی آنکھیں ابتداً کچھ چکاچوندسی رہتی ہیں جس کے باعث وہ ذاتِ باری تعالیٰ کی تشخیص اور اُس سے اپنے رشتہ کے متعیّن کرنے میں اُلجھے رہتے ہیں۔ اس بارگاہ میں مختلف مکاتیبِ خیال کے علمبرداروں سے انھیں سابقہ پڑتا ہے۔ اور وقتاً فوقتاً اُن کے نادیۂ نگاہ سے بھی اقبال ذاتِ باری تعالیٰ کی تشخیص کی کاوش کرتے ہیں۔ اُن کے ساتھ افلاطون بھی ہے۔ ابنِ عربی اور عبدالکریم الجیلی کی طرح وحدت الوجود کو ماننے والے فلسفی بھی ہیں۔ وحدتِ شہود کے علمبردار ابن تیمیہؒ اور شیخ احمدؒ سرہندی بھی ہیں۔ نطشے کی طرح خدا کے دشمن بھی ہیں۔ ورڈسورتھ کی طرح مجہول پرستار اور ٹیگور کی طرح رحم کے خواستگار بھی موجود ہیں۔ لیکن اقبال کو کسی پہلو قرار نہیں آتا، کوئی واضح صورت سامنے نہیں آتی۔ اس لئے وہ دُعا کرتے ہیں کہ :۔

میں بلبلِ نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا　　تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا دے

اُن کی دعاؤں اور پیچ و تاب کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور اِس کے ساتھ ہی اُن کے تصورِ باری تعالیٰ میں ایک ارتقائی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ اِس ارتقائی دور کو تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔۔۔ دورِ اوّل ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۸ء تک کا ہے جہاں اُن کے نزدیک خدا ایک "ابدی حُسن" (Eternal Beauty) ہے جو کیفیات اور خصوصیات کے آزادانہ وجود میں اُن کے وجود سے پہلے سے موجود رہتا ہے اور اُن میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ اقبال کے اس تصوّر کا ماخذ افلاطونی نظریہ ہے جس کے مطابق یہ ابدی حُسن ہر شئے کی اصل ہے۔ اُس کی روح اور آئیڈیل ہے۔۔ آفتاب کی تمازت میں، مہتاب کی دلکشی میں یہی حسُن موجود ہے۔ ستاروں کے طلوع اور شبنم کی افتاد میں، بیابانوں کی وسعتوں اور سمندروں کے طوفانوں میں، آگ کی حرارت اور شعلہ کی لپک میں، پہاڑوں کے شکوہ، پرندوں کی چہک اور انسان کے تکلّم میں اسی کا وجود ہے۔ پھولوں کی رنگینیوں میں، گلاب کی خوشبو میں، بلبل کے نغموں میں اِسی کا ظہور ہے۔!!

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے　　انساں میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے
یہ چاند آسماں کا شاعر کا دِل ہے گویا　　واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے
اندازِ گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ　　نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے، وہ پھول میں مہک ہے

اور یہ حسنِ مطلق جس طرح دانتے کے نزدیک اُس کی بیڑائس (Beatrice

کی آنکھوں میں جلوہ نما ہوتا رہا ہے۔ اُسی طرح اقبال کے خیال میں یہ حسن سب سے زیادہ اُن کی سلمیٰ کی آنکھوں سے چھلکتا رہتا ہے۔

ہر شئے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اُس کا   آنکھوں میں ہے سلمیٰ! تیری کمال اُس کا!

اور پروانہ کی تڑپ، شبنم کے آنسو، شیریں کا جمال اور فرہاد کا عزم، یہ سب اِسی حُسنِ ازلی کے مظاہر ہیں جس کی تلاش انسان پہ لازم ہے۔!

دکھا وہ حُسنِ عالم سوز اپنی چشمِ پرنم کو
جو تڑپاتا ہے پروانے کو، رلواتا ہے شبنم کو،

وہی اک حسن ہے لیکن نظر آتا ہے ہر شئے میں
یہ شیریں بھی ہے، گویا بیستوں بھی، کوہکن بھی ہے

گویا اقبال کے تخیل پہ وحدتِ وجود کا نظریہ اِس وقت غالب ہے۔ اِس نظریہ کی رُو سے ذاتِ باری ساری کائنات اور تمام نوعِ انسان میں جاری و ساری ہے۔ وہ حق اور خلق دونوں پہ حاوی ہے۔ تمام عالم میں وحدت کار فرما ہے۔ موضوع اور معروض کا فرق محض فریبِ نظر ہے۔ فطرت مظاہر کا ایک نظام ہے جو بیشمار اعتبارات کی بندھنوں میں جکڑا ہوا ہے۔ اِن اعتبارات کی تہہ میں ایک ہی ارادہ موجود ہے اور ایک ہی اصول کی تاثیر نمایاں ہے۔ معروضی طور پہ عالم غیر حقیقی ہے۔ وجود صرف ذاتِ باری کا ہے اور کثرت و تعدّد اِس کے مظاہر ہیں۔

کمالِ وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھکو گرے رگِ گُل سے قطرہ انسان کے لہو کا

ذاتِ باری کے متعلق ہندو فلسفہ کا بھی یہی رنگ معلوم ہوتا ہے۔ گیتا میں سری بھگوان

کہتا ہے :۔

"میں موسمِ گرما کی تپش ہوں اور موسمِ باراں میں بوچھاڑ کے ساتھ برسنے والا مینہہ بھی میں ہی ہوں"

اور یوگی کے متعلق فرماتا ہے کہ :۔

"وہ ہر شئے میں روحِ کل کے وجود کو محسوس کرتا ہے"

اس سے ظاہر ہے کہ ذاتِ باری کے متعلق ویدانتی اور افلاطونی نظریات ملتے جلتے ہیں۔ اور ابنِ عربی کی طرح اقبال بھی افلاطونی تخیّل سے ابتداءً متاثر معلوم ہوتے ہیں ـــــ لیکن اقبال کا یہہ تصوّر کہ خدا ایک ابدی حسن ہے اور ہر شئے میں موجود ہے زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکا۔ حسن کے ابدی اور مسبّب ہونے کے متعلق رفتہ رفتہ اُن کے دل میں شبہات پیدا ہونے لگے وہ سوچنے لگے کہ کائنات کا ہر حسن زوال پذیر ہوتا ہے۔ کلی کھلتی ہے مرجھانے کے لئے۔ شباب آتا ہے اور سوگوار چلا جاتا ہے اور موسمِ بہار جس کی آمد آمد پہ شادیانے بجائے جاتے ہیں چمن سے روتا ہوا لوٹ جاتا ہے ـــــ!

چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

اور یہہ حسن محض اضافی ہے ـــ بلکہ اس کا وجود ہی مشتبہہ ہے۔ یہہ صحیح ہے کہ حُسن کا تصوّر تمنّا کے لئے مہمیز ہے، جوانی کے افسانہ میں یہی رنگ بھرتا ہے اور انسانی تخیّل کو رفعت عطا کرتا ہے ـــ لیکن ایسے ابدی حسن کا وجود کہاں ہے ؟

کہتے ہیں کہ :۔

جلوۂ حُسن کہ ہے جس سے تمنّا بیتاب — پالتا ہے جسے آغوشِ تخیّل میں شباب
ابدی بنتا ہے یہہ عالمِ فانی جس سے — ایک افسانۂ رنگیں ہے جوانی جس سے
جو سکھاتا ہے ہمیں سر بہ گریباں ہونا — منظرِ عالمِ حاضر سے گریزاں ہونا،
دُور ہو جاتی ہے ادراک کی خامی جس سے — عقل کرتی ہے تاثر کی غلامی جس سے

آہ! موجود بھی وہ حُسن کہیں ہے کہ نہیں؟
خاتمِ دہر میں یارب وہ نگیں ہے کہ نہیں؟

لہٰذا ایسا حُسن جو زوال پذیر ہو، ایسا حُسن جو اضافی ہو بلکہ جس کا وجود ہی مشتبہہ ہو، ذاتِ باری تعالیٰ تو نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ذاتِ باری تعالیٰ کے کمال کو کوئی زوال نہیں، اُس کی بلندی پستی سے ناآشنا ہے اور وہ ایک مستقل، مستحکم اور طاقتور وجود ہے — !

اور یہاں سے اقبال کے تصوّر کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ جو سنہ ۱۹۰۸ء سے سنہ ۱۹۲۰ء تک جاری رہتا ہے۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں وہ یورپ گئے۔ وہاں جدید فلسفیوں اور مفکروں کے خیالات کو جانچا۔ اپنے اُستاد پروفیسر میکٹیگرٹ کے نظریۂ شخصی دوام (Personal Immortality) اور پروفیسر جیمس وارڈ کے نظریۂ Theistic Pluralism سے متاثر ہوئے۔ نطشے اور برگسان کا بھی مطالعہ کیا اور جب یہ محسوس کیا کہ ان اساتذہ کے چند بنیادی خیالات رُومی کے تصوّرات سے مشترک ہیں تو اُنہوں نے اپنے فلسفۂ خودی کی داغ بیل ڈال دی اور اس کے بعد حسن کی افادیت اور ابدیت کے بارے میں اُن کا عقیدہ مسلسل رو بزوال ہوتا گیا اور ارادہ (Will) کے متعلق اُن کے خیالات پختہ ہو گئے۔ وہ افلاطون کے تصوّر سے دُور ہوتے گئے اور اُن کا یہہ خیال ہو گیا کہ آرزو، جہد، تمنّا، کشمکش، ارادہ، قوّت اور عمل — اِن سب کا قوی ترین

مرکز خودی ہے۔ اور اسی خودی کو لئے ہوئے وہ بارگاہِ ایزدی میں ذاتِ باری کی تشخیص شروع کرتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ:۔

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی!

اب اُن کی آنکھیں بارگاہِ ایزدی میں کھلنے لگتی ہیں اور نگاہوں کی خیرگی زائل ہونا شروع ہوتی ہے۔ انھیں محسوس ہوتا ہے کہ خدا Absolute ego ہے، خودی مطلق ہے۔ وہ ابدی حسن نہیں ہے۔ حافظ اور افلاطون کا زاویہ نگاہ غلط ہے۔ کیونکہ خُدا ابدی ارادہ ہے اور حسن اُس کی ایک صفت ہے۔ لیکن اُس کی معرفت بغیر معرفتِ نفس کے ممکن نہیں ہے جیساکہ قرآن مجید نے فرمایا ہے:۔

کنت کنزاً مخفیاً فاحببتُ ان اعرف فخلقت الخلق
وتعرفت الیھم فعرفونی

یعنی انسان خود اپنی تلاش شروع کر دے تو ذات واجب تعالیٰ تک اُس کا پہنچنا یقینی ہے۔

دراصل نفس یا خودی انسانی ادراک و انفعال کے لئے بہت بڑا محرک ہے جس کو سمجھے بغیر خدا کو سمجھنے کی کوشش فضول ہے۔ گویا خدا کو بے نقاب کرنے کے لئے خودی کا استحکام ضروری ہے۔

کرا جوئی! چرا در پیچ و تابی!
کہ او پیدا ست تو زیرِ نقابی
تلاشِ او کنی جز خود نہ بینی،
تلاشِ خود کنی جز او نیابی

اقبال کے نزدیک حضورِ حق میں اپنے علیحدہ وجود کو باقی رکھنا ضروری ہے۔

ہمہ اوستی فلسفہ میں انسانی انا کی حق تعالیٰ کی انا مطلق میں تحلیل لازمی قرار دیگئی ہے تاکہ انسان کی علیحدگی کا کوئی "تخیل" ہی باقی نہ رہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ منصور حلاج کا نعرہ "انالحق" اسی فنائے ذات کی ایک شکل ہے ۔ لیکن اقبال کے خیال میں صورت حال اِس کے برعکس ہے۔ وہ کہتے ہیں یہہ نعرہ دراصل اس زمانہ کے اس "تصور" کو ایک چیلنج تھا جس کے مطابق خدا کو ایک ایسا مطلق العنان حکمران سمجھا جاتا تھا جو اس دُنیا سے بہت دور آسمانوں میں بیٹھکر اپنے احکام کو نافذ کرتا رہتا ہے۔ اُن کے نزدیک یہ نعرہ درحقیقت انسانی خود کے استحکام اور استقلال کی اس منزل کا اعلان تھا جہاں کہ وہ ذاتِ باری کے ذریعے اپنی بقا کا سامان "مہیا" کرتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ بقا کی یہ صورت فنائے ذات کے ذریعے کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ھیں جب خدا کے حضور میں کوئی پہنچے تو اُسے چاہئے کہ اپنے وجود کو اُس کے وجود میں ختم نہ کردے بلکہ اپنی وحدت اور اکائی کو باقی رکھے۔

چناں با ذاتِ حق خلوت گزینی ترا او بیند و او را تو بینی ، ،
بخود محکم گزار اندر حضورش مشو ناپید اندر بحرِ نورش
چناں در جلوہ گاہِ یار می سوز عیاں خود را نہاں او را فروزا

اس طرح اقبال کی فکر کا تیسرا دور ۱۹۲۰ء سے شروع ہو کر آخر تک قائم رہتا ہے جس میں ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق اُن کے عقائد اور خیالات راسخ ہوجاتے ہیں۔ اسلامی مفکرین کے نزدیک یہہ مسئلہ ہمیشہ زیرِ بحث رہا ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ متعین انا (Finite ego) ہے جو کائنات سے

بالکل علیحدہ ہے یا یہ کہ وہ غیر متعیّن انا Ego یا Immanent ہے جو تمام عالم میں جاری وساری ہے — اقبال کہتے ہیں کہ اس ذاتِ واجب تعالیٰ کی انا کی تخلیقی توانائی میں افعال و تصوّراتِ ملے جلے ہوتے ہیں جو مختلف وحدتوں کی شکل میں عالمِ خارجی میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور اس طرح سارا عالم ذاتِ واجب تعالیٰ ہی کی جلوہ گاہ ہے۔ ہستی دراصل خودی یا ایغو ہے جو انسانی وجود میں درجۂ کمال حاصل کرتی ہے اور چونکہ ذاتِ واجب تعالیٰ تمام ہستی کی اساسی ایغو ہے اس لئے انسان اپنی ایغو یا خودی کی ترقی اور تقویت ہی کے ذریعے اس اساسی ایغو کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔ اس وقت میں "خودی" کے رموز اور ٹکنک میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ یہ خود ایک وسیع موضوع ہے۔ البتہ اس قدر عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اقبال اس منزل تک — خودی کی خلوتوں میں کبریائی کے مقام تک — ایک شدید اور طویل عمل کے ذریعے پہنچے ہیں۔ آزمائشوں سے وہ گزرے، فنائے ذات کے تصوّر سے نجات حاصل کی۔ اور بالآخر جب اس بارگاہِ جلال و جبروت میں تقدیر کے پردہ کو، قسمت کے خیالی نقاب کو اُٹھا دیا تو نور کی شمع پر اُن کی نظریں جا پڑیں، مدّعا کو اُنھوں نے پا لیا اور اپنے دوست کو بے حجاب دیکھ لیا —!

گہے ہر پردۂ فطرت در بدیم　　جمالِ یار بے باکانہ دیدیم

وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ — بہت سے چہرے اُس دن تر و تازہ ہوں گے اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے —!

نگاہِ تصوّر سے دیکھیے اس بارگاہِ ایزدی میں اقبال

کے ساتھ بہت سارے بزرگ موجود ہیں۔ لیکن ان میں بہت کم ایسے ہیں جو جمالِ یار کو بے باکانہ دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں ورڈسورتھ بھی ہیں جو باری تعالیٰ سے اپنا مجہولی رشتہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ :۔

"خدا ہر جگہ موجود ہے۔ وہ ایک حرکت ہے جو ہر ذی شعور
وجود کو متحرک کرتی ہے، اور ہر شئے میں سما جاتی ہے —!

یعنی ورڈسورتھ محسوس کرتے ہیں کہ اُن کا وجود فطرت کی رُوح سے مغلوب ہو گیا ہے۔ اور اِس مغلوبیت کے عالم میں خدا کے اِس احسان کو وہ شکر کے ساتھ قبول کرتے ہیں! — اور پھر یہاں ٹیگور بھی موجود ہیں۔ ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہیں اور وہ رحم و کرمِ الٰہی کے محتاج معلوم ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ :۔

"جب آدھی رات کے تاریک مندر میں تیری عبادت کا
وقت آجاتا ہے تو میرے مالک مجھے حکم دے کہ میں تیرے
سامنے کھڑا ہو جاؤں اور تیرے سامنے گاؤں" اور

"تیری دنیا میں میرے لئے کوئی کام نہیں ہے۔ میری بیکار
آواز بے مقصد نغموں میں پھوٹ پڑتی ہے" اور

"اے خدا! مجھے طاقت عطا فرما تاکہ میں اپنی طاقت کو
عجز و انکسار اور محبت کے ساتھ تیرے تابع کر سکوں!"

ٹیگور اور ورڈسورتھ کی عقیدت کی اس مدھم فضا میں رومی کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ رومی کی آواز اُس عقاب کی آواز کی طرح محسوس ہوتی ہے جو کہ

سورج کی تیز شعاعوں میں پکارتا رہتا ہے اور جس کی آواز کی ہیبت سے چکوروں کا دِل دہل جاتا ہے اور شکار مسخر ہو جاتا ہے ۔۔۔! رومیؔ انسان کے مقام کو بہت بلند دیکھتے ہیں اور اپنے محبوب کو جس کی تلاش انھیں ہے، اپنے عزم اور حوصلے کے تعلق سے ایک شکار، ایک صیدِ زبوں سمجھتے ہیں ۔۔۔!

بزیرِ کنگرہِ کبریاش مردانند فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

رومیؔ کی یہ آواز اقبال کی خودی کو مہمیز لگاتی ہے اور وہ اقبال جو حجاب کے اٹھ جانے سے پہلے کہتے تھے کہ :۔

عشق بھی ہو حجاب میں، حسن بھی ہو حجاب میں یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

اب پورے اعتماد کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں بارگاہِ ایزدی میں کہ میرے حوصلوں کے لئے جبریل تو ایک معمولی شکار ہے، میں تو خود حضرتِ یزداں ہی کو اپنے کمند سے حاصل کر سکتا ہوں ۔۔۔!

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بارگاہِ ایزدی میں اقبال کو یہ تقرّب، یہ اعتماد کس طرح حاصل ہوتا ہے کہ وہ عقیدت کی منزل سے آگے نکل کر کہنے لگتے ہیں کہ

یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

اور پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

اُن کے کلام پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ۔۔۔ اُن کے عشقِ الٰہی نے

دراصل عقیدت اور تکلفات کی بندھنوں کو کاٹ دیا ہے اور ان کی خودی کو مضبوط کر کے ان میں خود اعتمادی پیدا کی ہے اور اُنہیں اُس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں وہ خود کو خدا کا حریف سمجھنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے خدا، تو نے اگر تاریک رات بنائی ہے تو میں نے اس رات کو چراغ کے ذریعے روشن کر دیا ہے۔ تو نے بیابان و کہسار بنائے ہیں تو میں نے خیابان اور گلزار بنائے ہیں۔ میں وہ ہوں کہ تیرے پتھر سے آئینہ بنا لیتا ہوں، میں وہ ہوں کہ تیرے زہر سے نوشینہ نکال لیتا ہوں۔!

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم ‌‌ ‌ ‌ سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیاباں و کہسار و راغ آفریدی ‌ ‌ ‌ ‌ خیاباں و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم! ‌ ‌ ‌ ‌ من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم!

اب بارگاہِ ایزدی میں عشق کی فراوانی و خودی کے استحکام کی بدولت اقبال کو ایک اور مقام بلند حاصل ہوتا ہے اور جس طرح عشق و محبت میں طنز بھی ہوتا ہے، اُسی طرح اُقبال بھی ذاتِ باری تعالیٰ پہ طنز کرنے لگتے ہیں کہ یہہ عالم جو تو نے بنایا ہے۔ ایسے کئی عالم میرے خیال میں غنچہ کی طرح چٹک جاتے ہیں، پھول کی طرح کھل جاتے ہیں! تو نے یہ دنیا تو بنالی ہے لیکن یہہ بھی ہماری تمناؤں کے خون سے بن سکی ہے ــــ!

صد جہاں روید از کشتِ خیالِ ما چو گُل
یک جہان و آں ہم از خونِ تمنّا ساختی!

اِس طنز کے لہجہ میں اور شدّت پیدا ہوتی ہے اور وہ خدا سے کہتے ہیں کہ تجھ میں درد شناسی کی کمی ہے۔ اِس لیے دکھیوں کی دنیا سے تیرا

کیا تعلق ہو سکتا ہے ؟ ہمارے تب و تاب کو سمجھنے کے لئے تو ہمارے ہی دلِ بیقرار کی ضرورت ہوتی ہے۔!

بہ جہانِ دردمنداں تو بگو چہ کار داری
تب و تابِ ما شناسی ، دلِ بیقرار داری!

اور اگر تو ہماری دردمندیوں کو محسوس نہیں کرتا تو ہم بھی اِس دنیا میں کوئی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا

اور پھر آدم علیہ السلام کے جنّت سے نکالے جانے کے قصّہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تو نے ہمارے راز سے ایک ایک ذرّہ کو آشنا کر دیا ہے۔ جنّت سے نکال کر تو نے ہمیں کس طرح رسوا کیا ہے اور ہمارے ساتھ کیا سلوک روا رکھا ہو ــــــ ؟!

آشنا ہر خار را از قصّۂ ما ساختی
در بیابانِ جنون بُردی و رسوا ساختی

اور تجھ میں تو مصالحت کا کوئی رنگ، آشنائی کا کوئی پہلو ہی نہیں ہے۔ تو نے نہ انسان سے مصالحت کی ہے اور نہ شیطان سے۔ حالانکہ انسان کا قصور صرف اتنا ہے کہ اُس نے دانۂ گندم کھا لیا تھا اور شیطان کی تقصیر اتنی تھی کہ اُس نے ایک سجدہ سے انکار کر دیا تھا۔

جرمِ ما از دانۂ، تقصیرِ او از سجدۂ   نے بہ آں بیچارہ می سازی نہ با ما ساختی

اِس دُنیا میں تو مجھ پر پابندیاں عائد کرنا چاہتا ہے۔ اِس کی دلچسپیوں سے مجھے باز رکھنا چاہتا ہے اور یہہ کہتا ہے کہ میں شیطان اور اُس کے وسوسوں سے دور رہوں — لیکن تو ہی بتا کہ یہہ شیطان کہاں سے آیا ہے ! یہہ کس کا پروردۂ ناز رہا ہے ؟!

جہاں از خود بروں آوردۂ کیست ؟ جمالش جلوۂ بے پردۂ کیست ؟
مرا گوئی کہ از شیطاں حذر کن ؟ بگو با من کہ او پروردۂ کیست ؟

اور تجھے اپنی ایسی زندگی کا حال کیا بتاؤں جو چند گنی چنی سانسوں پر مشتمل ہے۔ میری زندگی کی نارسائیوں اور مجبوریوں کا احساس تو صرف اُسی کو ہو سکتا ہے جس کی خود زندگی مستعار ہو اور جسے غمِ روزگار لاحق رہتا ہو — !

چہ گویمت نہ جانے کہ نفس نفس شمارد
دمِ مستعار داری ؟ غمِ روزگار داری ؟

اِن حالات میں، میری اِن مجبوریوں، میری رسوائیوں اور دردمندیوں کے پس منظر میں، جب تو بروزِ حشر کرسیٔ صدارت پر جلوہ افروز ہوگا تو کیا تو سمجھتا ہے کہ میں خاموش بیٹھا رہوں گا ؟ نہیں بلکہ ۔

خاموش نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

اور اِس پر تو مجھ سے پرسش کرنا چاہیگا تو سمجھ لے کہ میرے اِن حالات کے مدِّ نظر تجھے خود بھی پشیمان ہونا پڑے گا —

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل آپ بھی شرمسار ہو، مجھکو بھی شرمسار کر

لیکن ایسے طنز اور ایسی شدید تنقید کے بعد اقبال جب اپنے مخاطب کی حالت پر غور کرتے ہیں تو اُنھیں کچھ اپنی ترش روئی کا احساس ہوتا ہے جس سے ان کے لطیف احساسات میں تموّج پیدا ہوتا ہے — وہ دیکھتے ہیں کہ ان کا مخاطب ساری کائنات میں تنہا ہے اور اس کے لئے کوئی بزم آرائی کا سامان موجود نہیں ہے۔ چنانچہ اُن کے دل میں اُس کے لئے درد پیدا ہوتا ہے اور وہ اُس کی دلچسپی کے اسباب مہیّا کرنا چاہتے ہیں —!

مرا دل سوخت بر تنہائیِ او　　　کنم سامانِ بزم آرائیِ او

اور اس غرض کے لئے وہ اپنے معشوق کو منانے کی کوشش کرتے ہیں، اُس کو لبھاتے ہیں اور اُسے مشورہ دیتے ہیں کہ اِن باتوں سے کیا فائدہ، آگے بڑھ اور شعارِ محبت اختیار کر — اِس پارسائی کو چھوڑ دے، میرے سینے میں آ، یہاں آرام کر محنت و کلفتِ خدائی سے تھوڑی دیر کے لئے فرصت پالے —!

خوشتر ز ہزار پارسائی　　　گامے بطریقِ آشنائی
در سینۂ من دمے بیاسائی　　　از محنت و کلفتِ خدائی

اس طرح دونوں میں مصالحت ہو جاتی ہے، گویا کہ راضی نامہ ہو جاتا ہے —! اور اقبال مزید کوئی قدم آگے نہیں بڑھاتے۔ اُن کے دل کا غبار دُھل جاتا ہے، شکوہ و شکایت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے — پیار و محبت اور ناز و نیاز کا دور شروع ہوتا ہے اور محبت کی سخت گیریوں اور آزمائشوں کا ذکر چھڑ جاتا ہے — وہ اپنے محبوب سے کہتے ہیں کہ تیری طلب میں دل شعلہ فشاں رہا ہے۔ تیری جستجو میں دیر و حرم کی تعمیر میں نے کی ہے، تیری محبت

میرے لئے متاعِ بے بہا رہی ہے۔ لیکن تو، اے میرے محبوب، میرا تماشہ دیکھتا رہا ہے۔!

در طلبش دل تپید، دیر و حرم آفرید
ما بہ تمنائے او، او بہ تماشائے ماست

میری زندگی تیرے لئے وقف رہی ہے۔ تیری آرزو میری جدوجہد کی محرک، تیری جستجو میری لطافتوں کی خالق اور میری مسرتوں کی ماخذ رہی ہے۔! میں نے ہر قدم تیرے ہی کوچہ کی طرف اُٹھایا ہے ــــ بلاکشانِ محبت بکوئے یار روند۔ اور اگر کبھی میرا قدم کسی اور سمت میں اُٹھا ہے تو اُس راستہ نے مجھے سانپ کی طرح ڈسا ہے۔!

سوز و گدازِ زندگی لذتِ جستجوئے تو
راہ چو مار می گزد گر نروم بسوئے تو

اس لئے اب میری کلفتوں کو دور کر، جامِ شراب میری طرف بڑھا اور مجھ سے کھل کر باتیں کر ــــ اور تیری اس بزم میں بہار کا رنگ ہو، تیرا حسن شباب پر ہو، تیرے نغمے فضاؤں میں کیف اور ہواؤں میں مستی پیدا کر رہے ہوں اور تو بصد ناز و انداز، بہ ہزار عشوہ و ادا بادۂ ناب میری طرف بڑھا رہا ہو:

فصلِ بہار ایں چنیں، بانگِ ہزار ایں چنیں
چہرہ کشا، غزل سرا، بادہ بیار ایں چنیں!

اور میرے دلبر! تیرے فراق میں آنسو بہاتا رہا ہوں، تیری نگاہِ برق انداز کا آرزومند ہوں ــــ برقِ نظر کا واسطہ برقِ نظر گرائے جا ــــ اور میں نے

آج تک یہ دِل کسی اور کو نہیں دیا ہے - یہہ دلِ بیقرار صرف تیرے ہی لئے بے چین و مضطرب رہا ہے - دنیا کی کوئی رعنائی میری نگاہ میں نہیں جچی ہے اور میں ایسے اچھوتے اور پاکیزہ دِل کو لیکر تیری بارگاہ میں آیا ہوں — !

اشکِ چکیدہ ام ببیں ، ہم بہ نگاہِ خود نگر
ریزہ بہ نیستانِ من برق و شرار ایں چنیں!
دِل بکسے نباختہ ، با دو جہاں نساختہ!
من بحضورِ تو رسم روزِ شمار ایں چنیں!

اِس وقت اقبال خدا سے قریب تر ہو جاتے ہیں، خدا اُن سے قریب تر ہو جاتا ہے — نحن اقرب الیہ من حبل الورید — اُن کی رگِ گردن سے زیادہ قریب ہو جاتا ہے - وہ اُسے اب بہت تفصیل سے جاننے لگتے ہیں اور انسان کے لئے اُس کی بے پناہ محبت کی گہرائیوں اور وسعتوں کا اندازہ کرتے ہیں - وہ محسوس کرتے ہیں کہ انسان دراصل خدا سے دور ہوتا ہے حالانکہ خدا انسان کی — مردِ کامل کی — جستجو میں لگا رہتا ہے - کائنات کی ہر شیئے اُس کی اِس تمنّا کی شہادت دیتی ہے، دُنیا کی ہر بات اِس محبت پر دلالت کرتی ہے! وہ کبھی برگِ لالہ پہ پیامِ محبّت لکھ بھیجتا ہے اور کبھی مرغانِ چمن کے سینے سے محبّت کی آہیں بلند کرتا ہے - !

ما از خدائے گم شدہ ایم، او بجستجوست   چوں ما نیاز مند و گرفتارِ آرزوست
گاہے بہ برگِ لالہ نویسد پیامِ خویش   گاہے درونِ سینۂ مرغاں بہ ہاؤ ہوست!

اقبال کے اِن احساسات سے خدا متاثر ہوتا ہے، اپنی بارگاہ میں اُن کے ممتاز

مقام کو تسلیم کر لیتا ہے اور نہایت ہمدردانہ طور پر جس کی توقع اُس کی الوہی ذہانت سے کی جا سکتی ہے اُن کی ہمّت افزائی کرتا ہے، اُن کی محبّت کا صلہ دینا چاہتا ہے اور اُنہیں رازِ حیات سے آگاہ کر دیتا ہے — ! وہ کہتا ہے کہ بقا کا راز تعمیر و تخلیق میں ہے۔ تخلیق کا جوہر اور ذوق وشوق کا عنصر انسان کو کائنات کی حکومت اور حیاتِ جاوید عطا کرتے ہیں۔ اور جو انسان کہ تخلیق کی قوت نہیں رکھتا وہ کافر و زندیق سے بدتر ہوتا ہے۔ ضرورت بلند حوصلگی کی ہے، بات جب ہے کہ انسان اپنی دُنیا کا آپ معمار اور آپ اُس کی تقدیر بن جائے۔ !

زندگی ہم فانی و ہم باقی است — ایں ہمہ خلّاقی و مشتاقی است
زندہ مشتاق شو، خلّاق شو — ہمچو ما گیرندۂ آفاق شو
ہر کہ او را قوّتِ تخلیق نیست — پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست
مردِ حق! برّندہ چوں شمشیر باش! — خود جہانِ خویش را تقدیر باش!

گویا تخلیق اہمیّت رکھتی ہے۔ یہ اصل ہے ہر بات کی۔ خدا دیگر تمام خالقین سے برتر و بالا ہے — فتبارک اللہ احسن الخالقین — یعنی خدا تو سب سے بڑا خالق ضرور ہے، لیکن اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے انسان بھی یہ تخلیقی صفت حاصل کر سکتا ہے اور دنیا میں عملِ تخلیق کو جاری رکھ سکتا ہے۔!

اقبال اِس مشورہ کو قبول کر لیتے ہیں لیکن ساتھ ہی خدا سے شکوہ بھی کرتے ہیں کہ تیری تخلیق غیر محدود ہے کیونکہ تو زمان و مکان کی تحدیدات سے بالاتر ہے لیکن مجھے تو نے ان کی بندھنوں میں مقید کر دیا ہے۔

تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ — اپنے لئے لامکاں، میرے لئے چار سو

اور کہتے ہیں کہ بلاشبہ تو نعیم ہے، رحیم ہے، تیری دولتوں کا احاطہ ناممکن اور تیرا اقتدار غیر محدود ہے — لیکن انسان کو تو اپنی نعمتیں اس قدر ہاتھ روک کر کیوں عطا کرتا ہے اور کیوں بے شمار تحدیدات اُس کے رزق پر عائد کرتا اور بے انتہا رکاوٹیں اُس کی تخلیق میں پیدا کرتا ہے - ؟

تیرے شیشے میں مے باقی نہیں ہے! بتا کیا تو میرا ساقی نہیں ہے!
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم بخیلی ہے یہہ رزاقی نہیں ہے!

اور پھر خدا کی عظمت، اُس کے جلال و جبروت اور اُس کے اقتدار و حکومت کے پس منظر میں جہانِ آب و گل کو دیکھتے ہیں، اس کی مجبوریتوں اور زندگی کی ریکیوں کو دیکھتے ہیں، یہاں کے رہنے والوں کی تکلیفوں اور مصیبتوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ایسی دنیا ایسے زبردست خالق کے شایانِ شان نہیں معلوم ہوتی اور اس لئے وہ اسے کہتے ہیں کہ :-

ایں چنیں عالم کجا شایانِ تست
آب و گلِ داغے کہ بر دامانِ تست

اقبال پھر اس دنیا کے لیل و نہار پر غور کرتے ہیں تو اِن میں کوئی نئی بات انہیں نظر نہیں آتی — وہی پُرانے کھیل جگت کے وہی پُرانی بات۔ ان کی جدت پسند طبیعت اس صورتِ حال سے اکتا جاتی ہے اور وہ خدا کو مشورہ دیتے ہیں کہ یا تو نئی دنیا بسا یا مجھ سے نیا امتحان لے یہہ کیا کہ تو میرے ساتھ وہی بات کرے جو قبل ازیں بار بار کر چکا ہے —!

یا جہانے تازۂ یا امتحانے تازۂ می کُنی تا چند با ما آنچہ کردی پیش ازیں

خدا کی تخلیق کے بارے میں اپنی اس تنقید اور مشورہ کے لئے اقبال معذرت بھی پیش کرتے ہیں۔ اے خدا! میں تیرا ادنیٰ غلام ہوں، تیرے احکام کا پابند اور تیری خوشنودی کا آرزومند ہوں، لیکن ساتھ ہی امتیازِ نیک و بد بھی تو نے مجھے دیا ہے، خودی اور خود داری کا جوہر بھی عطا کیا ہے اور اسی سبب سے اگر تو یہ چاہے کہ میں گدھے کو گھوڑا کہوں تو میرے لئے یہ ناممکن ہے—!

غلامم جز رضائے تو نجویم، جز آں راہے کہ فرمودی نہ پویم
و لیکن گر بہ ایں ناداں بگوئی خرے را اسپِ تازی گو، نگویم

اور پھر وہ اپنا جائزہ لیتے ہیں تو انہیں رنگ رنگ کی تخلیقی صلاحیتیں نظر آتی ہیں اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ خدا کی تخلیق میں وہ رنگینی اور کشش پیدا کر سکتے ہیں۔ اس لئے وہ خدا کو مشورہ دیتے ہیں کہ بادِ بہار کو حکم دے کہ وہ ان کے خیال کی تقلید کرے، کیونکہ اُن کا خیال دشت و بیابان کو بھی نقش و نگار عطا کرتا ہے۔ اُن کے نفس سے زادگانِ باغ و راغ کو تراوت نصیب ہوتی ہے۔ اس لئے خدا کو چاہیئے کہ جہانِ آب و گِل کو اُن کے دِل کی دُنیا کی طرح تشکیل دے:

بادِ بہار را بگو، پے بخیالِ من برد وادی و دشت را دہد نقش و نگار ایں چنیں
زادۂ باغ و راغ را از نفسم تراوتے درچمنِ تو زیستم باگل و خار ایں چنیں
عالمِ آب و خاک را بر محکِ دلم بسائے
روشن و تارِ خویش را گیر عیار ایں چنیں

اس نوبت پر اقبال کی تخلیقی صلاحیتوں کا احساس، ان کا ایقان مستحکم تر ہو جاتا ہے اور وہ اپنی نئی دُنیا کی تعمیر میں لگ جاتے ہیں، زمین و آسمانِ مستعار

کو پھونک ڈالتے ہیں اور خاکستر سے ایک نئے جہان کی تخلیق شروع کرتے ہیں ــــ اور خدا کو متوجہ کرتے ہیں کہ دیکھ یہہ ذرۂ ناچیز ایک نئی زمین، ایک نیا آسمان بن رہا ہے ــ!

خاکِ ناخیزد کہ سازد آسمانے دیگرے
ذرۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر !

غور کیجئے کہ اقبال کی یہ گفتگو ایک فانی انسان کی ذاتِ ایزدی سے گفتگو نہیں ہے۔ بلکہ باری تعالیٰ سے باعزت مشورہ ہے اقبال کا جنہوں نے "تعمیر خودی میں ہے خدائی" کے اصول پر کارفرما ہو کر قربِ خداوندی حاصل کیا ہے ــ اور یہہ وہ منزل ہے جہاں حور و فرشتہ اُن کے اسیر ہو جاتے ہیں ۔ اور خدا کی تجلیوں میں اُن کی نگاہِ تیز سے خلل واقع ہونے لگتا ہے ــــ!

حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں!

اور یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں ہر شخص اپنی اپنی ہمت اور اپنی اپنی بساط کے مطابق اپنے مشاہدات، تجربات اور جذبات کا اظہار کرنے لگتا ہے، جہاں بایزید بسطامی "سبحانی ما اعظم شانی"، کا ورد کرتے ہیں اور منصور حلاّج "انا الحق"، کا نعرہ بلند کرتے ہیں ــــ اور یہہ ایسی نازک صورت ہوتی ہے کہ جس کی صراحت عقل و منطق کی بنیاد پر الفاظ کے ذریعے بہت مشکل، بہت دشوار اور بہت خطرناک ہوتی ہے ــ!

حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ
حقیقت ہے آئینہ، گفتار زنگ

فروزاں ہے سینے میں شمعِ نفس
مگر تابِ گفتار کہتی ہے بس

اگر یک سرِ موئے برتر پرم،
فروغِ تجلّی بسوزد پرم ،

اقبال اور کشمکش و انقلاب

کامیابی یا کامرانی جو انصاف کا دوسرا نام ہے حالتِ جمود میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کو سکوت اور بے بسی میں تلاش نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کا تصوّر کسی مردِ مجاہد، کسی زندہ و بیدار قوم کے قلب مضطر ہی میں پیدا ہوتا ہے، ہیبتناک توپوں کے دہانوں میں پرورش پاتا ہے، آہن پوش جنگی جہازوں کے مہیب مستولوں پر پروان چڑھتا ہے۔!

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موجِ زخود رفتہ تیز خرامید و گفت ہستم اگر میروم گر نروم نیستم

اقبالؒ اور کشمکش و انقلاب

انسان کی فطرت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ گوشت و پوست کا معمولی انسان کشمکش و انقلاب سے گریز کرتا ہے اور ہمیشہ چین و سکون کا طالب ہوتا ہے۔ کبھی وہ کہتا ہے کہ:۔

"بھکاری سا میرا دل اگر غریب ہو کر کہیں گوشۂ تنہائی میں شرما کر بیٹھ جائے تو میرے مالک! تم دروازہ توڑ کر میرے لئے سکونِ زندگی لے کر جلوہ افروز ہو جانا" (ٹیگور)

کبھی کہتا ہے کہ:۔

"چلو تم اُدھر کو جدھر کی ہوا ہو"

اور کبھی اِس حکمتِ عملی پہ کاربند ہونا چاہتا ہے کہ:۔

زمانہ با تو نسازد　　تو با زمانہ بساز　　(سعدیؒ)

یعنی وہ زمانہ کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا چاہتا ہے اور زمانہ سازی کو اپنا مسلک بنانا چاہتا ہے ـــــ دراصل انسان کے ذہن و فکر کی یہی وہ کمزوری ہے جو فرد کو ترقی سے محروم اور غیر کی نظرِ کرم کا محتاج کر دیتی ہے اور قوموں کو ذہنی اور بسا اوقات

سیاسی غلامی میں جکڑ دیتی ہے - اسی وجہ سے رومی نے فرمایا کہ :-

"کوشش بیہودہ بہ از خفتگی"

اور اسی سبب سے شاعرِ مشرق نے قناعت، راحت و چین کے فرسودہ نظریوں کو نذرِ آتش کر کے جستجو اور انقلاب کی ہمیں تعلیم دی اور کہا کہ :-

حدیث بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

یعنی زمانہ سازی بے خبروں کی حکمتِ عملی ہے، زمانہ تجھے نہیں بناتا ہے بلکہ تجھے چاہیئے کہ زمانہ سے ٹکرائے اور اُس سے متصادم ہو۔ اقبال نے یہ نتیجہ بہت غور و فکر کے بعد اخذ کیا ہے۔ اُنھوں نے قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ــــ اور خود اپنے ہی ملک و قوم کی تاریخ بھی اُن کے سامنے تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ غزنوی کی تڑپ، شہاب الدین غوری کے سوز، تیمور کی جستجو میں حمیّتِ قومی ارتقائی منازل طے کرتی رہی، اور بابر کے پیچ و تاب پر معراجِ کمال کو پہنچ گئی ــــ اور پھر اکبر کی جنس پرستی سے زوال کی تاریخ شروع ہو کر جہانگیر کی رنگینی اور شاہجہاں کی تن آسانی سے گذرتی ہوئی شہزادگانِ دہلی کی محفلِ عیش و نشاط میں داخل ہو گئی جہاں کہ قانونِ قدرت نے اُس پر اپنی آخری مہر لگا دی ــــ

ان حالات میں اقبال نے اِس شکست خوردہ قوم کو پستی سے نکال کر بلندی کی طرف لے جانا چاہا، اُنھوں نے عشق پہ بجلی کو حلال اور منزل کو حرام قرار دیا، رہ نوردِ شوق کو منزل کی طرف جانے سے روکا اور مجنوں کو تاکید کی کہ :-

لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول!

اور اِس طرح ان کے دلِ بیقرار نے راحت وچین اور زمانہ سازی کے سومنات کو پاش پاش کر کے ایک اعلیٰ ترین آئیڈیل دنیا کے سامنے رکھا جس پر اظہارِ خیال کے لیے آپ کے سکریڑی نے مجھے حکم دیا ہے ــــ!

اقبال کے تصور کے مطابق انقلاب تغیر اور ترقی ہے اور کشمکش زندگی کی علامت ہے۔ ان کے نزدیک کائنات اور ہر ذی روح کی موجودہ شکل ہزاروں برس کی ارتقائی جدوجہد، تصادم اور پیکار کا نتیجہ ہے اور حقیقت ایسے اجزا کا مجموعہ ہے جو تصادم اور کشمکش کے ذریعے باہمی ربط پیدا کر کے زمانہ کی صورت میں تبدیلی اور ترقی کا باعث ہوتے ہیں۔ یعنی جسے ہم حقیقت کہتے ہیں وہ انقلاب ہے اور انقلاب قانونِ قدرت ہے جس سے فرار موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ گویا کہ انقلاب سے انسان کو استحکام اور استقلال حاصل ہوتا ہے اور اس کے لئے اقبال صرف سیاسی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ عمرانی اعتبار سے بھی انقلاب کو ضروری سمجھتے ہیں ــــ لیکن دُنیا کی اکثر تہذیبوں میں تصادم اور کشمکش کے متعلق برعکس نقطہ نظر پایا جاتا ہے اور اس لحاظ سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تفصیلات میں جانے سے پہلے ایک لمحہ کے لئے اِن نقاطِ نظر کو بھی معلوم کر لیا جائے۔

کہا جاتا ہے کہ کسی قوم کی تہذیب اُس کے طریقۂ فکر کی آئینہ دار ہوتی ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قدیم یونانی تہذیب اکثر تہذیبوں کا منبع رہی ہے اور آج بھی متعدد مکاتیب خیال اُس کے تابع نظر آتے ہیں۔ لیکن اس تہذیب کو عریانی میں دیکھا جائے تو یہ جامد، ساکت، غیر متحرک اور غیر ترقی پذیر معلوم

ہوتی ہے کیونکہ اس میں نفسِ انسانی کی جدوجہد اور نشوونما کا کوئی تصوّر پیش نہیں کیا گیا ہے۔ افلاطون کے نظریہ کے مطابق انسان میں خود اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنی زندگی کی تشکیل اور کائنات کی تسخیر کر سکے۔ اُس کے خیال میں دنیا صرف فریبِ نظر ہے اور اِس کے حادثات محض دھوکہ ہیں۔ ارسطو نے اگرچہ اِس کے اِس نظامِ تصوّرات پر سخت تنقید کی ہے لیکن اُس نے بھی انسانی عمل کی آزادی پر مطلق زور نہیں دیا بلکہ اُس کی رائے میں سیاسی ادارے بھی ایک معیّنہ چکّر کے پابند ہیں۔ اسی طرح بدھ مت نے زندگی کو "مایا" ایک فریب، ایک گناہ قرار دیا اور جستجو اور انقلاب کی بجائے نفس کُشی کو انسانی نجات کا ذریعہ سمجھا۔ عیسائیت نے بھی زندگی کی جدوجہد سے گریز سکھا کر ترکِ دنیا اور رہبانیت کی طرف نوعِ انسان کو لیجانا چاہا — اور پھر یوگا فلسفہ کو لیجیے جو گنگا اور جمنا کے دوآبہ میں پیدا ہوُا اور ہمالیہ کے دامن میں پروان چڑھا۔ اس فلسفہ نے جسے خونریز جنگوں اور تباہ کاریوں کے پس منظر میں شکست خوردہ اور غمزدہ انسانوں میں پھولنے اور پھلنے کے مواقع ملے، نوعِ انسان کو گرمیِ حیات سے محروم کر دیا اور، دردوسوزِ آرزومندی کی متاعِ بے بہا سے اس کو محروم کر کے پہاڑوں کی غاروں میں زندگی بسر کرنے کی دعوت دی۔ پتنجلی کہتے ہیں کہ:۔

"انسان جب انسانی زندگی کے چار مادی مقاصد یعنی نیکی، دولت، تمنّا اور نجات کے تصوّرات سے چھٹکارا حاصل کرتا ہے تو اُس کی خالص خودی آزاد ہو کر فطرتِ اصلی اور خودیِ مطلق سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔"

شوپنہار نے قنوطیت کے فلسفہ کو طاقتور استدلال سے پیش کر کے اُسے ایک نظریۂ حیات کی شکل دینے کی کوشش کی ہے۔ اُس کے نزدیک زندگی کے تمام مظاہر ایک اندھے ارادے کی تخلیق ہیں۔ زندہ رہنے کا ایک اندھا اور بے مقصد ارادہ ہر طرح ظاہر ہونے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ رنج وغم، درد و کرب اس کے نتائج ہوتے ہیں اور چونکہ ایک اندھا ارادہ زندگی کا ماخذ ہے اس لئے اِس کا کوئی علاج بھی نہیں ہے اور اِسی سبب سے تہذیب و تمدّن میں ترقی کے ساتھ ساتھ مسرت اور خوشحالی میں ترقی نہیں ہوتی بلکہ رنج والم، تباہی و بربادی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے — ایسی صورت میں زندگی کی جدوجہد دراصل طمع اور خودغرضی کی کشمکش ہوتی ہے جو جمادات، نباتات، حیوانات اور نوعِ انسان، سب کے لئے مضرّت اور پریشانی کا باعث ہوتی ہے۔ شوپنہار کے خیال میں ویدانت اور بدھ مت زندگی کا یہی تصوّر پیش کرتے ہیں — اور اس لئے انسان کا حقیقی مقصد زندگی سے فرار ہونا چاہیئے — !

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام صورتیں دراصل انسان کے شکست خوردہ ذہن کا عکس ہیں اور اِن میں اُس انسان کی تمام نفسیاتی کیفیات پائی جاتی ہیں جو زندگی کی دوڑ میں ہار مان کر بیٹھ جاتا ہے اور خودکشی کی طرف مائل ہو جاتا ہے — لیکن اسلام نے جمود اور سکوت کو انسانیت کے لئے مہلک اور کشمکش و جستجو کو انسانی ترقی کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ فرمایا گیا کہ:-

اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ لا وَّاَنْ عَسٰۤی اَنْ یَّکُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ

(اعراف ۱۸۵)

یعنی کیا یہ لوگ آسمان اور زمین کی تخلیق پر غور نہیں کرتے، اس کے متعلق جستجو نہیں کرتے؟ معلوم ہوتا ہے کہ اِن کی موت قریب آگئی ہے — یعنی قدرت کے نزدیک کشمکش اور جستجو سے گریز کی سزا قوموں کو موت کی شکل میں دی جاتی ہے اور اِسی سبب سے قرانِ مجید میں روزہ، نماز وغیرہ کے متعلق ڈیڑھ سو آیات آئی ہیں تو اُن آیات کی تعداد جو انسان میں جذبہ عمل اور ذوقِ انقلاب پیدا کرتی ہیں سات سو چھپن ہے! اقبال کی شاعری کا سرچشمہ آبِ حیات بھی قرآن ہی ہے اور اسی منبع سے اُن کی ساحری نے فیض حاصل کیا ہے، اسی لئے وہ انسان میں عقابی روح پیدا کرنا چاہتے ہیں اور اُس کی تن آسانی کو دور کر کے اور محفلِ رقص و سرود سے نکال کر رزم گاہِ حیات تک اُسے پہنچا دینا چاہتے ہیں!!

عصرِ جدید کا جرمن فلسفی نطشے قنوطیت کو ایک مرض سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ صحتمند انسان کشمکشِ حیات سے لطف اندوز ہوتا ہے اور جوئے کہستاں کی طرح اُچھلتے، کودتے، مشکلات پر سے گزر جاتا ہے — لیکن وہ یہ بھی کہتا ہے کہ شوپنہار کے خیال کی طرح زندگی محض زندہ رہنے کا ارادہ نہیں ہے بلکہ یہ حصولِ اقتدار کا ارادہ ہے کیونکہ ہر جاندار دوسروں کی قربانی پر زندہ رہتا ہے۔ لہٰذا ہر کوشش کسی نہ کسی طرح حصولِ اقتدار کے لئے ہوتی ہے اقتدار ہی انسانی زندگی کی بنیادی قدر ہے اور رنج و مسرت، نفع و نقصان کی باقی تمام صورتیں محض فریب ہیں — اس سے ظاہر ہے کہ کشمکشِ حیات کے بارے میں نطشے کا تصوّر ظالمانہ اور بہیمانہ ہے۔ اور اس سبب سے ناقابلِ عمل اور ناقابلِ قبول ہے۔ نیز وہ یہ بھی کہتا ہے کہ فطرت اپنے عمل کو دوامی طور پر دہراتی رہتی ہے۔ اِس وقت اشیا اور کائنات کی جو صورت ہے

وہ اس سے قبل بھی رہ چکی ہے اور آئندہ بھی یہ صورت بار بار پیدا ہوتی رہے گی ۔ تو اس کا یہ تصوّر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ارتقاء کے خلاف ہے اور زندگی کو ناقابلِ برداشت بنا دیتا ہے ۔ ہمیں صرف ایسی بات کی تمنّا ہو سکتی ہے جو بالکل جدید ہو لیکن نطشے کے مطابق بالکل جدید شئے کا تصوّر ممکن نہیں ہے ۔ اور یہ بات قسمت اور تقدیر پرستی کی ایسی انتہائی شکل ہے کہ جو انسان کو کشمکشِ حیات کے لئے تیار کرنے کی بجائے اُس کی تمام عملی صلاحیتوں کو زنگ آلود اور اُس کی خودی کے تناؤ کو کمزور کر دیتی ہے ۔۔۔! اس کے برعکس اقبال فرماتے ہیں جدّت ترقی کی روح ہے اور کائنات کی رنگینی اسی کے سبب سے ہے ۔!

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

کشمکش اور انقلاب کے متعلق ہنری برگساں اور اقبال کے خیالات میں ایک حد تک مماثلت پائی جاتی ہے ۔ برگساں کے فلسفہ کی اساس یہہ تصوّر ہے کہ تغیّر کائنات کی بنیادی حقیقت ہے ۔ زندگی ماحول کے مسلسل تغیّر کا نام ہے اور "حقیقت" ایک حقیقی تغیّر ہے ۔ وہ ایک عظیم الشان قوّتِ محرکہ ہے جو کہ انسان اور حیوان کو آگے دھکیلتی رہتی ہے ۔۔۔! اقبال بھی تغیّر کی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلامی اصول یونان کی قدیم، جامد اور ساکت تہذیب کے خلاف زبردست ردِّ عمل تھا کیونکہ اسلام نے زندگی کی حقیقتوں پر اپنی تعلیمات کی بنیاد رکھی ہے اور انسان کو زوال اور جمود سے بچانے اور اُس کے ممکناتِ حیات کو اُجاگر کرنے کے راستے بتائے ہیں ۔ چنانچہ وہ زندگی سے

گریز اور رہبانیت کو "ناسورِ جسمِ ملّت" اور "ننگِ وجود" کہتے ہیں اور افلاطون کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ ایک معذور اور لاچار انسان تھا جو ذوقِ عمل سے محروم تھا اور اسی سبب سے وہ دنیوی قدروں کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے اس چیز کو مفید سمجھا۔ جو دراصل مُضر ہے۔ اور چونکہ وہ دنیوی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا اس لئے اُس نے ترکِ دنیا ہی میں اپنی نجات کی راہ متعین کی ہے — کہتے ہیں :۔

فکرِ افلاطوں زیاں را سود گفت　　　حکمتِ او بود را نابود گفت

بس کہ از ذوقِ عمل محروم بود　　　جانِ او وارفتۂ معدوم بود

راہبِ ما چارہ غیر از رم نداشت

طاقتِ غوغائے ایں عالم نداشت

اس طرح اقبال نے افلاطونی اور یوگی رجحانات کے زہریلے اثرات کو ذہنِ انسانی سے زائل کرنے کی کاوش کی اور بتایا کہ انسان اپنے عمل اور اپنی زندگی پر قادر ہے۔ اُس کی تقدیر کوئی نہ ٹلنے والی مقسوم نہیں ہے جو باہر سے جبراً اُس پر عائد کی گئی ہو۔ بلکہ وہ صاحبِ اختیار ہے، صاحب اقتدار ہے، اُس کی زندگی اس کے عمل پر مبنی ہے اور اُس کا مستقبل اُس کی جستجو اور کشمکش پر منحصر ہے ۔!

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں

تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے!

اس طرح انسان کو کشمکش اور جستجو کی طرف مائل کرنے اور میدانِ عمل کی طرف لیجانے کی اقبال نے بڑی تحریک و ترغیب دی ہے وہ کبھی اس کی حمیت کو

مہمیز لگاتے ہیں کہ —

گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی،
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

کبھی سخت کوشی کی لطائف کو بے پردہ کرتے ہیں کہ —

فریب خوردۂ منزل ہے کارواں ورنہ
زیادہ راحتِ منزل سے ہے نشاطِ رحیل

اور کبھی اُن کی نگاہِ تیز دلِ وجود کو چیر کر حقیقت کو اس طرح آشکار کرتی ہے کہ —!

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات، تڑپتا ہے ہر ذرّۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

اور پھر انسانی رفعت و بلندی کی ایک اعلیٰ منزل پر وہ خود پہنچتے ہیں اور تمام نوعِ انسان کو وہاں تک آنے کی دعوت دیتے ہیں کہ :-

عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک

وہ ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہیں اور انسان کو اس کی زندگی کی اصلیت بھی بتاتے ہیں کہ —

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

صرف آگے بڑھنے ہی کی دعوت نہیں دیتے ہیں بلکہ انسان کو اُس کے مقصدِ حیات اور اُس کے میدانِ عمل کی وسعت سے بھی آگاہ کرتے ہیں کہ ـــــ

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر ـــــ چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا ـــــ ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اور پھر اُس کی بے پناہ قوت اور آئینِ فطرت پر اس کی حکومت کی وسعت کی بھی ایک حیات آفریں تصویر پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے انسان! یہ زمین، یہ آسمان، یہ بادل، یہ گھٹائیں تیرے تابعِ فرمان ہیں۔ زمانہ تیری آنکھوں کے اشارے کا منتظر ہے۔ آفتاب کی روشنی تیری روح میں اور جنت کی رنگینیاں تیرے خونِ جگر میں پوشیدہ ہیں ـــــ! لیکن اس کے لئے صرف ایک ہی شرط ہے اور وہ شرط کوششِ پیہم اور کشمکشِ دوام ہے!! فرماتے ہیں کہ ـــــ

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل، یہ گھٹائیں ـــــ یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں ـــــ تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ،

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے ـــــ دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے ـــــ پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں ـــــ آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں،
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں ـــــ جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

جہاں کوششِ پیہم اور جہدِ مسلسل کے حسین نتائج کو اقبال نے بے نقاب کیا وہاں انھوں نے زندگی اور حیات کا بھی ایک حقیقت افروز تصور ہمارے سامنے پیش کیا ہے ——— زندگی اُن کے نزدیک ایک اضطراب ہے، ایک آہنگ مسلسل ہے، ہمیشہ ابلنے والا ایک چشمہ ہے، کبھی نہ سوکھنے والا ایک دھارا ہے۔ ایک قوت ہے جس کا ظہور کائنات کی ہر شئے میں ہوتا ہے، اور یہ ایک ایسی انقلابی قوت ہے کہ جو کبھی بڑے بڑے پہاڑوں کو سرنگوں کر لیتی ہے اور کبھی جبریل و حور کو مسخر کرنے لگتی ہے ——— !

دمادم رواں ہے یمِ زندگی	ہر اک شئے سے پیدا رمِ زندگی
چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے	یہ چاندی میں، سونے میں، پارے میں ہے
اسی کے بیاباں، اسی کے ببول	اسی کے ہیں کانٹے، اسی کے ہیں پھول

کہیں اس کی طاقت سے کہسار چور
کہیں اس کے پھندے میں جبریل و حور

اور پھر کہتے ہیں کہ زندگی محض ایک جرائتِ رندانہ ہے۔ یہی جرائتِ رندانہ ہماری تمام کوششوں کا ماحصل، اُن کا صلہ اور انعام ہے ——— !

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقابِ سالخورد	اے ترے شہپر پہ آساں رفعتِ چرخِ بریں
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام	سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزہ ہے اے پسر
وہ مزہ شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں!

زندگی ذوقِ انقلاب اور حوصلہ مندی کا دوسرا نام ہے اور اسی لیے کبھی وہ

شاہین کے ذوقِ خون آشامی میں جلوہ نما ہوتی ہے تو کبھی اُس کبوتر کے عزم و ہمت میں ظاہر ہوتی ہے جو آشیانہ سے دُور، بہت دور نکل جاتا ہے، جال میں پھنستا ہے اور پھڑ پھڑانے لگتا ہے ۔۔۔!

کہیں جرہ شاہین سیماب رنگ — لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ
کبوتر کہیں آشیانہ سے دُور — پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور!

کشمکش اور انقلاب سے گریز جیسا کہ میں نے عرض کیا انسان کی اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ ٹھوکروں سے گھبراتا ہے اور پُرسکون زندگی کا خواہشمند ہوتا ہے۔ چنانچہ ٹیگور کہتے ہیں کہ:۔

"تو نے مجھے ہمیشہ ہی کڑی ٹھوکروں سے بچایا ہے۔ یہی تیری انتہائی عنایت میری رگ رگ میں جذب ہو گئی ہے۔"

دراصل عناصرِ فطرت انسان کی راہ میں مزاحم ہوتے ہیں۔ لیکن جب وہ ان پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے تو اُن کی یہ مزاحمت امداد و تعاون میں تبدیل ہو جاتی ہے اور آئینِ فطرت انسان کو آگے بڑھانے میں مدد کرنے لگتے ہیں ۔۔۔ لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان اس مزاحمت کے تصوّر ہی سے خوفزدہ ہو کر بیٹھ جاتا ہے اور نتیجتاً اس کی ترقی رُک جاتی ہے، اُس کی زندگی ساکت، جامد اور غیر تخلیقی ہو کر رہ جاتی ہے ۔۔۔ ایسے ہی سہمے ہوئے انسانوں کو اقبال آواز دیتے ہیں کہ:۔

کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں — بیٹھے ہیں کب سے منتظر دیر و حرم کے سومنات

اور

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں؟ — گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

اُن کا مطلب یہہ ہے کہ مزاحمت اور مخالفت سے نہ صرف انسان کے عزم میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ اِن سے اُس کی بصیرت میں بھی وسعت پیدا ہوتی ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ :۔

ہیں عقدہ کشا یہہ خارِ صحرا   کم کر گلۂ برہنہ پائی

یعنی اگر تیرے پاؤں میں کانٹے چبھ رہے ہوں تو گلہ مت کر کہ میں ننگے پاؤں ہوں کیونکہ اِن کانٹوں سے دشت و صحرا کی حقیقت تجھ پر آشکار ہوتی ہے، خارِ صحرا صحرا کا حل تیرے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اِس لئے کِسی حالت میں بھی، کِسی صورت میں بھی تجھے پریشان نہ ہونا چاہیئے۔ سخت مشکلات میں، طوفان خیز موجوں میں، تیز و تند آندھیوں میں بھی تجھے نہیں گھبرانا چاہیئے کہ ـــــ

تندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اُڑانے کے لئے

غور کیجیے کہ عافیت پسندی سے افراد اور اقوام کی طبائع میں جو تباہ کن سستی، سکوت و جمود پیدا ہوتے ہیں اُن کا ازالہ صرف کشمکش اور انقلاب ہی سے ممکن ہے۔ انقلاب فی الحقیقت انسان کی طاقت و توانائی، عزم و استقلال اور جسمانی و روحانی ممکنات کو بیدار و آشکار کر دیتا ہے۔ چنانچہ آپ جانتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک جتنے پیغمبرانِ دین و مصلحین آئے ہیں۔ اُن سب کے عزم و عمل کی حرارت حق و باطل کی کشمکش ہی کا نتیجہ رہی ہے اور تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ قوموں کی زندگی اور طاقت و توانائی ہمیشہ اُن کے ذوقِ انقلاب ہی کی رہین منت ہوتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مشرق کی قوموں نے زندگی کی جد و جہد سے گریز اختیار کیا تو سیاسی اور

معاشی اعتبار سے مُردہ ہو گئیں۔ لیکن مغرب کی قومیں اپنے ذوقِ تحقیق اور جستجو کی بدولت آگے ہی بڑھتی گئیں، اور آج وہ جو کائنات اور آفاق کی قوتوں پر حکمران ہوتی جا رہی ہیں اور سائنس کی ترقی اور تسخیرِ فطرت کے ذریعے انسانی عظمت کی حقیقی منزلیں طے کرتی جا رہی ہیں وہ اُن کے اُس اعلیٰ ترین جذبہ ہی کا نتیجہ ہے جس کو اقبال نے دردو سوزِ آرزومندی اور ذوقِ انقلاب سے تعبیر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ :۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی،

روحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب!

مزاحمت جب ایک حد سے آگے بڑھ جاتی ہے تو انسان اُسے "خطرہ" کا نام دیتا ہے اور اُس کی شدت کے تناسب سے فرار اختیار کرتا ہے۔ یعنی خطرہ جس قدر سنگین ہو گا اُسی قدر وہ دور ہٹتا جائے گا ـــــ لیکن اسلامی تعلیمات کے مطابق الا ان اولیاء اللّٰہ لاخوفٌ علیھم ولا ھُم یحزنون یعنی جو لوگ اللہ کے دوست ہوتے ہیں وہ کسی بات سے نہ ڈرتے ہیں اور نہ مایوس ہوتے ہیں ـــــ اقبال بھی اسی نقطۂ نظر کے حامی ہیں۔ اِس لئے وہ کہتے ہیں کہ اصلی زندگی کا لطف خطرات سے کشمکش کرنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے ـــــ!

اگر خواہی حیات اندر خطر زی!

کیونکہ اُن کے خیال کے مطابق

خطر تاب و تواں را امتحان است

عیارِ ممکناتِ جسم و جان است

یعنی خطرہ انسان کی جسمانی اور روحانی طاقت کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔ اس لئے

فرماتے ہیں کہ:-

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا — ہوائے زندگانی نرم خیز است

بدریا غلط و باموجش در آویز — حیاتِ جاوداں اندر ستیز است!

یعنی ساحل کی زندگی میں کیا کشش اور کیا رعنائی ہو سکتی ہے جہاں کہ ہوا نہایت مدھم چلتی ہے۔ لطف تو طوفان خیز دریاؤں کی مغرور موجوں سے دست گریباں ہونے ہی میں پیدا ہوتا ہے کہ اصلی اور غیر فانی زندگی کا راز جنگ اور تصادم ہی میں پنہاں ہے ـــــ!

انسان کے نزدیک خطرات میں بھی سب سے بڑا خطرہ موت کا ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ اس منزل پہ پہنچتا ہے جہاں کہ خوفِ مرگ اُس کے دل سے زائل ہو جاتا ہے تو وہ بھی غیر فانی ہو کر حیاتِ جاودانی حاصل کر لیتا ہے ـــــ! اسی سبب سے سرکارِ دو عالمؐ نے فرمایا ہے کہ میری اُمّت روبزوال نہیں ہو گی۔ اور اگر ہو گی تو صرف دو باتوں سے، ایک تو مال کی محبت اور دوسرے موت کا خوف۔ دراصل ایسا ہوتا ہے کہ خوفِ مرگ کے زیرِ اثر انسان ہزاروں بے بنیاد خوف اپنے دل و دماغ پر مسلّط کر لیتا ہے۔ جس کی وجہ سے اُس کی تمام صلاحیتیں زنگ آلود ہو کر فنا ہو جاتی ہیں لیکن خدا کی رحمت ہوتی ہے اُس انسان پر جس کا تخیّل خوفِ مرگ سے آزاد ہوتا ہے کیونکہ فانی ہونے کے باوجود اُس کی ضربِ کلیمی سے خود موت خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑی ہوتی ہے ـــــ!

بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ — یک مقام از صد مقامِ اوست مرگ

می فتد بر مرگ آں مردِ تمام — مثلِ شاہینے کہ افتد بر حمام

ہر زماں میرد غلام از بیمِ مرگ — زندگی او را حرام از بیمِ مرگ

یعنی جو کمزور ہوتا ہے وہ غلامانہ زندگی بسر کرتا ہے، وہ ہر لمحہ خوفِ مرگ سے مرتا رہتا ہے، اور اِس طرح اُس کی زندگی اُس پر حرام ہو جاتی ہے — ! Cowards die many a time before their death

لیکن جو مردِ کامل ہوتا ہے، اس کی مثال شیر کی سی ہے جس کے سامنے موت بھاگنے والے ہرن کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ مردِ کامل موت پر اس طرح حملہ آور ہوتا ہے جس طرح کہ شاہین کبوتر پر جھپٹتا ہے۔ اور ایسا انسان ذوقِ عمل کے باعث تمام اندیشوں سے بالاتر ہو کر ساری مادی اضافتوں سے گزر جاتا ہے، اور خود خطرات کو لرزہ بر اندام کر کے موت پر فتح حاصل کر لیتا ہے — !

میں عرض کر رہا ہوں کہ خطرات کے مدِّ نظر انسان کشمکش اور انقلاب سے پرہیز کرتا ہے۔ خطرات میں بھی سب سے بڑا خطرہ اُس کے نزدیک موت کا ہوتا ہے، اور اُس موت کا خطرہ زیادہ سنگین ہوتا ہے جو جنگ و جدال میں واقع ہوتی ہے۔ حقیقتاً میدانِ جنگ ہی جہاں زندگی کی رنگینیاں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں اور حیات کے تبسّم پر موت کے گھناؤنے سائے دراز ہو جاتے ہیں، انسان کے ذہن و عمل کی کشمکش معراجِ کمال کو پہنچ جاتی ہے — لیکن جو اس کشمکش کی تاب نہیں لا سکتا وہ راہِ فرار اختیار کرتا ہے، اور عسکریت کی روح بیتاب ہو کر پکار اٹھتی ہے اور فضائے بسیط میں تلاطم پیدا کرتی ہے کہ — !

گریزد از صفِ ما ہر کہ مردِ غوغا نیست،
کسے کہ کشتہ نشد از قبیلۂ ما نیست:

اسی وجہ سے نیکی کی اغراض کے لیے کشمکش اور ذوقِ انقلاب کو زندہ رکھنے

اور اُن کی ہمت افزائی کرنے کی خاطر اسلام نے ایسی موت کا مقام بہت بلند کر دیا ہے۔ فرمایا گیا:۔

لا تقولوا من یُقتلوا فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولٰکن لا یشعرون یعنی جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں انھیں مردہ مت کہو، کیونکہ وہ تو زندہ رہتے ہیں اور حیاتِ سرمد حاصل کر لیتے ہیں۔ اسی لئے اقبال بھی ایسی موت کو امتیازی حیثیت دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ:۔

گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر
مرگِ پورِ مرتضیٰؓ چیزے دگر

یعنی اگرچکہ ہر موت مومن کے لئے پر لطف ہوتی ہے، لیکن سید الشہداء کی موت کا لطف کچھ اور ہی ہے۔ اور پھر شمشیر و سناں اور تیر و تفنگ سے اپنی دلچسپی اور مسلکِ حسینؓ سے اپنی وابستگی کا اعلان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

تیر و سناں و خنجر و شمشیرم آرزوست
با من میا کہ مسلکِ شبیرؓ م آرزوست

کیونکہ اُن کے خیال کے مطابق شمشیر و سناں سے نہ صرف فرد کی عظمت اور رفعت کی ضمانت ہوتی ہے بلکہ قوموں کی زندگی اور زندگی کی لقا بھی شمشیر و سناں کے بغیر ممکن نہیں ہے ——!

میں تجھکو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر!

حقیقتاً اعلیٰ ترین مقاصد کے لیے جنگ اور خونریزی ہی میں قوموں کی طاقت کا

رازِ پوشیدہ ہے۔ کامرانی کے لئے اضطراب، جستجو اور کشمکش کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی اچھے نتیجہ کو برآمد کرنے کے لئے قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ

خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

یعنی رات کی تاریکی میں ہزاروں ستارے پوری طاقت اور توانائی کے ساتھ کشمکش کرتے رہتے ہیں اور جب صد ہزار انجم اپنا خون کر چکتے ہیں تب نورانی صبح نمودار ہوتی ہے ـــــ اسی طرح زندگی کی بقا کے لئے بھی قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے، طاقت اور کشمکش کی ضرورت ہوتی ہے، اور تاریخ بتاتی ہے کہ اصلی کشمکش تلوار کی کشمکش اور زندگی کا سرچشمہ آبِ حیات خون کی ندیوں اور فواروں ہی میں رہا ہے۔ دُنیا میں آج تک کوئی دور ایسا نہیں گزرا جبکہ تلوار کی طاقت ضعیف ہوئی ہو یا خون کی ندیوں اور فواروں سے حیات بخشنے کی تاثیر زائل ہوئی ہو۔ وہ لوگ بہت مقدس ہیں، بہت نیک ہیں وہ لوگ جو خونریزی و خوں آشامی کو ختم کر کے دُنیا کو معصوم فرشتوں کی بہشتِ زار بنانا چاہتے ہیں اور بو اِین رد کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر، چودھری صاحب[1]، ایسے مسائل کا حل دریافت کرنا چاہتے ہیں جن کا حل تاریخ نے ہمیشہ پانی پت کے میدان ہی میں پیش کیا ہے ـــــ! اِن لوگوں کی اِس آرزو کے حسن و جمال پر کون دل سے فریفتہ نہ ہوگا۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ دُنیا معصوم آرزوؤں اور نیک تمناؤں کی نہیں بلکہ تلخ حقائق کی جگہ ہے جہاں جب بھی کشمکش ہی زندگی کی ضامن اور مظلوم کے ہاتھ میں اُس کی حفاظت کی آخری ڈھال ہے!

---

[1] اِس جلسہ کی صدارت قائد کشمیر چوہدری غلام عباس کر رہے تھے

میں عرض کرتا ہوں کہ کامیابی یا کامرانی جو انصاف کا دوسرا نام ہے حالتِ جمود میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کو سکوت اور بے بسی میں تلاش نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس کا تصوّر کسی مردِ مجاہد، کسی زندہ و بیدار قوم کے قلبِ مضطرب میں پیدا ہوتا ہے، ہیبتناک توپوں کے دہانوں میں پرورش پاتا ہے، آہن پوش جنگی جہازوں کے مہیب مستولوں پر پروان چڑھتا ہے —! اور آج اگر آپ اصلی زندگی اور زندگی کے مظاہر کو دیکھنا چاہیں تو انہیں آپ رنگین محفلوں میں، پرسکون فضاؤں میں، سنیما تھیٹروں میں، نرم و نازک اور زرق برق لباسوں میں نہیں دریافت کر سکتے بلکہ اُن خاکی پوش سپاہیوں کی فولادی صفوں میں اُنہیں تلاش کیجیے جن کی چاپ کی دہشت سے زمین کا دل دہلنے لگتا ہے، اور اُن آہنی توپوں کی لمبی قطاروں میں اُنہیں محسوس کیجیے کہ جن کی گرج سے کائنات کی یخ بستہ رگوں میں خون کھولنے لگتا ہے —!! اور کائنات کا سب سے بڑا انصاف کرنیوالا، کامیابی اور کامرانی کا عطا کرنے والا بھی یہی فرماتا ہے کہ :-

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معهم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط وانزلنا الحدید فیه باس شدید ومنافع للناس۔

یعنی ہم نے رسولوں کو بھیجا کھلی نشانیوں کے ساتھ اور اُن پر کتابیں نازل کیں تاکہ لوگوں میں انصاف ہو سکے۔ اور جہاں اللہ تبارک تعالیٰ انصاف کا ذکر کرتا ہے وہاں یہ بھی فرماتا ہے کہ ہم نے لوہا بھی پیدا کیا جو ظالموں کے ہاتھ میں خطرناک بھی ہے اور انصاف پسندوں کے ہاتھ میں مفید بھی —!

ہر جدو جہد، ہر حرکت کے لئے کسی نہ کسی محرک کی ضرورت ہوتی ہے۔اسی طرح کشمکش حیات کے لئے بھی قوی ترین محرک کا وجود لازمی ہے اقبال کے نزدیک "عشق" اس منصب کو انجام دیتا ہے۔ کلام اقبال میں "عشق" خود ایک مستقل عنوان ہے جس پر آج مجھے کچھ کہنا نہیں ہے۔[1] تاہم نظیریؔ کی زبان میں اتنا ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ:-

سلطانِ ازل گنجِ غمِ عشق بما داد
مارو ئے دریں منزلِ ویرانہ نہادیم

یعنی عشق کے اثر سے فرد کی زندگی اور کائنات کی بزمِ خموشاں میں رونق پیدا ہوتی ہے کائنات کا سکوت حرکت میں بدل جاتا ہے۔ حرکت سے جوشِ حیات پیدا ہوتا ہے اور انسان بھی کشمکشِ حیات کے لئے آمادہ و تیار ہو جاتا ہے ــــ!

عشق از فریادِ ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد
ورنہ ایں بزمِ خموشاں ہیچ غوغائے نداشت

یعنی اِس مقدس اور پاکیزہ جذبہ سے معمور ہو کر انسان جدوجہد اور انقلاب کی طرف مائل ہوتا ہے، اُس کی نظریں بلند ہو جاتی ہیں، وہ اپنی منزل کو آسمانوں ہی متعیّن کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ:-

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

---

[1] دیکھیے "اقبال کا تصورِ عشق"، ص ۱۲۹

اور آسمانوں پر پہنچ کر وہ مہر و ماہ پر کمند پھینکنے لگتا ہے اور ستاروں کو توڑ کر اپنے گریباں میں لگانا چاہتا ہے ——!

بہ مہر و ماہ کمندِ گلو فشار انداز ،
ستارہ را زِ فلک گیر و در گریباں کش!

لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ آسمانوں ہی پہ کیا منحصر ہے ، آسمان کے چاند تاروں ہی پہ کیا منحصر ہے ، انسان تو سعیِ پیہم اور ذوقِ انقلاب میں آسمانوں سے بھی آگے بڑھتا ہے ۔ کائنات کی تسخیر کامل چاہتا ہے ، یہاں تک کہ جبرئیل کو بھی خاطر میں نہیں لاتا بلکہ خود خالقِ کائنات کی تسخیر کا عزم کر لیتا ہے اور عشق و مستی سے سرشار ہو کر پکار اُٹھتا ہے کہ ——!

در دشتِ جنونِ من جبرئیل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمّتِ مردانہ!

اقبالؔ اور آرٹ

اصلی آرٹسٹ اپنے ماحول سے مسلسل کشمکش کرتا رہتا ہے، اُس کی صلاحیتوں پر قوم کی روحانی صحت کا انحصار ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے لامحدود امکانات کو تلاش کرتا ہے، اور کائنات میں نفسِ انسانی کی فوقیّت کا آرزومند ہوتا ہے۔

زمن با شاعرِ رنگیں بیاں گوئے | چہ سود از سوز اگر چوں لالہ سوزی
نہ خود را می گدازی ز آتشِ خویش | نہ شامِ دردمندے بر فروزی

خرد کہ پاس راز رّینہ سازد | کمالش سنگ را آئینہ سازد
نوائے شاعرِ جادو نگارے | زنیشِ زندگی نوشینہ سازد

۱۔ آرٹ کا تصوّر

۲۔ ہمہ گیری

۳۔ فطرت کی عکاسی

۴۔ غزل

۵۔ درد آفرینی

۶۔ مسلک

۷۔ اجزائے ترکیبی

۸۔ الفاظ

۹۔ آمد

۱۰۔ تنقیدی آرٹ

اقبال اور آرٹ

تصور اقبال آرٹ برائے آرٹ کے قائل نہیں ہیں۔ اُن کے نزدیک آرٹ کا مقصد زندگی میں سوز و ساز اور حسن اور فراوانی کی تخلیق ہے۔ اور اُس کی غرض انسانی فطرت کے لطیف اور پاکیزہ عناصر کو اپیل کر کے اُسے کشمکشِ حیات کے لیے تیار کرنا ہوتا ہے۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

بے معجزہ دنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں

جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

آرٹ کی غرض ایک جاندار اور صحت مند انسان کی تخلیق ہونی چاہیئے۔ ایک ایسے انسان کی تعمیر اس کا مقصد ہونا چاہیئے جس کے دِل کی دھڑکن کائنات کے نغمات سے ہم آہنگ ہو۔ جو آرٹسٹ اِن مقاصد کو اپنے پیشِ نظر رکھتا ہے وہ اپنی آرزو کے سوز کی بدولت ملّت کے لئے ایک صحت مند دل کی حیثیت رکھتا ہے جو تمام جسم کو تازہ خون کے ذریعے زندگی فراہم کرتا رہتا ہے۔ درحقیقت ایسا ہی

آرٹسٹ پیغمبروں کا وارث کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے ـــــ!

شعر را مقصود اگر آدم گری است

شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

لہٰذا ہر شخص جو شعر کہتا ہو شاعری کا دعویدار نہیں ہو سکتا۔ غلام قوموں میں جھوٹے شاعروں کی بہتات ہوتی ہے جو غلامی کی زنجیروں کو کاٹنے کے بجائے انہیں زیادہ مضبوط کرنے کا باعث ہوتے ہیں ـــــ وہ رازِ حیات سے واقف نہیں ہوتے۔ اُن کی قدریں منقلب ہوتی ہیں۔ وہ زندگی کی چنگاری کو غیر شعوری طور پر بجھانا چاہتے ہیں کیونکہ اُن کے نزدیک شر خیر ہوتا ہے، بدصورتی کو وہ حُسن سمجھتے ہیں اور نفع و نقصان میں امتیاز ان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ وہ اپنے طریقہ پر انسان کی خدمت تو ضروری کرنا چاہتے ہیں لیکن اُن کی ہر کوشش مضرّت رساں اور ہر اقدام ہلاکت آفریں ہوتا ہے ـــــ اُن کے مس سے پھولوں کی خوشبو زائل ہوتی ہے، اُن کی موجودگی میں بلبل اپنے نغمے بھول جاتی ہے اور اُن کی تعلیم سے انسانی حیات کشمکش و تجسس کی راہیں فراموش کر کے بے حس و حرکت ہو جاتی ہے۔ یہ شاعر ہمیں بتاتے ہیں کہ ہر چیز کا انجام موت ہے، اس لئے ہمیں جدوجہد کی کیا ضرورت ہے، باطل سے کشمکش میں ہمیں کیا مل جاتا ہے۔ اور طوفان خیز موجوں کے مقابلہ سے ہمیں کیا حاصل ہو سکتا ہے ـــــ!

وہ کہتے ہیں کہ دنیا کی ہر شے خاموشی کے ساتھ رو بزوال ہو کر قبر میں داخل ہوتی ہے جہاں اُسے سکون نصیب ہوتا ہے۔ ہر شے اُبھرتی ہے لیکن بہت جلد گھٹنے لگتی ہے یہاں تک کہ فنا کی آغوش میں پہنچ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں

جہد و انقلاب کے لئے دردِ سر ہم کیوں مول لیں ——؟ سکون پرور خواب، راحت انگیز بے حسی اور قناعت آمیز زندگی ہی انسان کے لئے خوش آئند ہو سکتے ہیں۔! اور پھر بجلی کی کڑک سے وہ سہم جاتے ہیں، بادل کی گرج سے لرز جاتے ہیں، آندھیوں کے آگے سر جھکا دیتے ہیں اور طوفانی ریلے اُنھیں خس و خاشاک کی طرح بہا لیجاتے ہیں! —— اقبال کہتے ہیں کہ ایسے تمام شاعروں کو ختم کر دینا حیاتِ اجتماعی کے تحفظ کے لئے بہت ضروری ہے کیونکہ وہ خوبصورت الفاظ میں ماتم کا درس دیتے ہیں اور زندگی و مسرت کا پیام دینے کی بجائے ماحول میں افسردگی پیدا کرتے رہتے ہیں۔!

اقبال نے وقت کی اِس اہم ضرورت کی تکمیل کی۔ اُنھوں نے محسوس کیا کہ قوم کے زوال کے ساتھ ساتھ شاعری بھی پستی کی آخری منزل میں داخل ہو چکی ہے اور وقت آگیا ہے کہ مِلّت کو خوابِ غفلت سے بیدار کر کے تباہی کے اسباب سے آگاہ کیا جائے —— وہ کہتے ہیں کہ آرٹ کو زندگی کا خادم ہونا چاہیئے۔ ایسا آرٹ بیکار بلکہ نقصان دہ ہے جو روحانی اور اخلاقی اقدار کی تخلیق نہ کرتا ہو۔ اصلی آرٹسٹ اپنے ماحول سے مسلسل کشمکش کرتا رہتا ہے۔ اُس کی صلاحیتوں پر قوم کی روحانی صحت کا انحصار ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے لامحدود امکانات کو تلاش کرتا ہے اور کائنات میں نفسِ انسانی کی فوقیت کا آرزو مند ہوتا ہے۔ مرقعِ چغتائی کے دیباچہ میں اقبال کہتے ہیں کہ:۔

"کسی قوم کی روحانی صحت کا دار و مدار اُس کے شعرا اور آرٹسٹس کی الہامی صلاحیت پر ہوتا ہے۔"

اور

"کسی زوال پذیر آرٹسٹ کی تخلیقی تحریک، اگر اُس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنے نغمے یا تصویر سے لوگوں کے دِل لبھا سکے، قوم کے لئے بہ نسبت اٹیلا یا چنگیز خاں کے لشکروں کے زیادہ تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔"
اور

"انسانی قوت کا راز یہہ ہے کہ فطرت کے ہیجانات کے خلاف مقاومت اختیار کی جائے نہ کہ اُن کے عمل کے سامنے اپنے تئیں رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے۔ جو کچھ موجود ہے اُس کی مقاومت اِس واسطے کرنی چاہیئے کہ جو کچھ موجود نہیں ہے اُس کی تخلیق ہو۔ ایسا کرنا صحت و زندگی سے عبارت ہے۔ اس کے ماسوا جو کچھ ہے وہ زوال اور موت کی طرف لے جانے والا ہے۔ خدا اور انسان دونوں دائمی تخلیق سے قائم و زندہ ہیں۔"

یہہ تخلیقی جدوجہد آرٹسٹ کی اندرونی قوت کو بیدار کر کے تناؤ کی حالت پیدا کرتی ہے جو کہ کسی شخصیت یا خودی کے ارتقار کے لئے ضروری ہے۔ انسان کو کھلونوں کی فراہمی آرٹسٹ کا منصب نہیں ہے۔ اِس سے اُس کی اعلیٰ صلاحیتیں ضائع ہو جاتی ہیں اور قوم کو من حیث الکل شدید نقصان پہنچتا ہے۔ در حقیقت اصلی مصوری یا صحت مند شاعری نہ صرف حسن کو نزاکت اور خوبصورتی کو دوام بخشتی ہے بلکہ انسان کی تھکی ہوئی توانائیوں کو تازہ کر کے اُس کی تقدیر کو بھی بدل دیتی ہے۔ شیلے کہتا ہے کہ

"شاعری ہر شئے میں کشش پیدا کرتی ہے، حسن کو عظمت اور بدصورتی کو

جمال عطا کرتی ہے اور اپنے لمس سے اشیاء کی ہیئت کو بدل دیتی ہے۔"

صحت مند شاعری انسان کے ارادہ میں استقلال اور تاریخ میں انقلاب پیدا کرتی ہے وہ ایک حیرت انگیز آئینہ ہوتی ہے جس میں مستقبل کا عکس حال کے پردہ پر صاف نظر آسکتا ہے۔ ایسی شاعری آغوشِ جنون میں پرورش پاتی ہے۔ وہ شاعر کے خونِ دل میں حل کی ہوئی ایک آگ ہوتی ہے۔ وہ فطرت کی تخلیق میں اضافہ کرتی اور ایک نئی دنیا کی تعمیر کر کے قلب انسانی کو حیاتِ نو عطا کرتی ہے ——!

نغمہ می باید جنوں پروردہ، آتشے در خونِ دل حل کردہ
نغمہ گر معنی ندارد مردہ ایست سوزِ او از آتشِ افسردہ ایست
آں ہنرمندے کہ بر فطرت فزود رازِ خود را بر نگاہِ ما کشود،
آفریند کائناتِ دیگرے
قلب را بخشد حیاتِ دیگرے

شاعر کا خونِ دل دراصل اس کا خلوص ہوتا ہے جس کے بغیر شعر کو عظمت یا کسی فن کو کمال نصیب نہیں ہو سکتا ——!

برگِ گل رنگیں ز مضمونِ من است
مصرعِ من قطرۂ خونِ من است

خلوص کی بدولت آرٹ میں نقالی نہیں آسکتی کیونکہ ایسی صورت میں وہ معروض نہیں بلکہ موضوعی ہو جاتا ہے اور خود اپنے احساسات اور جذبات کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ یہ موضوع حسن ہوتا ہے جس کو آرٹسٹ کی آنکھیں ہر شے میں

دیکھ لیتی ہیں۔ اسی حسن سے آرزو پیدا ہوتی ہے اور آرزو عشق کی تخلیق کرکے انسانی زندگی کو مہر و پروین کے ہمدوش کر دیتی ہے ——!

حسن خلاقِ بہارِ آرزوست　　جلوہ اش پروردگارِ آرزوست

سینۂ شاعر تجلّی زارِ حسن　　خیزد از سینائے او انوارِ حسن

از نگاہش خوب گردد خوب تر

فطرت از افسونِ او محبوب تر

ہمہ گیری اقبال کی شاعری میں عالمی اپیل پائی جاتی ہے کیونکہ اُس میں حقائق کیساتھ ساتھ مسرّت آمیز رجائیت موجود ہے۔ اس کا ایک سبب اُن کی شاعری کی وسعت بھی ہے جس میں زندگی کے ہر پہلو پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اُنہوں نے دو زبانوں میں شاعری کی ہے اور تیسری زبان میں تیاری کر ہی رہے تھے کہ اُن کا انتقال ہو گیا۔ فارسی اور اُردو میں بجز ڈرامہ[1] کے باقی تمام اصنافِ سخن اُن کے ہاں موجود ہیں۔ جہاں فلسفۂ حیات اُن کے کلام کی روح ہے وہاں غزل، گیت، رزمیہ نظم، مرثیہ اور رباعی کا بھی اُن کی شاعری میں وجود ہے۔ رومی کے سوز و گداز کے ساتھ اُنہوں نے فلسفۂ حیات کو پیش کیا ہے اور اُسی بصیرت کیساتھ حقائق کا انکشاف بھی کرتے رہے ہیں۔ مثلاً مسئلۂ جبر و قدر ہی کو لیجیے۔ قرآن فرماتا ہے "نبلوکم حتی نعلم المجاھدین منکم" یعنی ہم تمہیں آزمائیں گے تاکہ اُن لوگوں کو جان لیں جو تم میں سے مجاہد ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسان کو انتخاب کا اختیار نہ ہو تو اُس کی آزمائش کے کیا معنی؟ —— اِس سلسلہ میں مولانا رومی فرماتے ہیں کہ تیرا یہ کہنا کہ میں کل یہ کرونگا، وہ کرونگا، تیرے اختیار کی دلیل ہے۔ گناہ کر کے

---

[1] جیسا کہ مارماڈیوک محمد پکتھل نے کہا ہے "ڈرامہ اور نقالی کا اسلامی تہذیب میں کوئی جواز نہیں ہے" مغرب نے ان کو "فن" کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ لیکن دراصل یہ خودداری اور شرم و حیا کے بدترین دشمن ہیں۔

تو پشیمان ہوتا ہے یہی تیرے اختیار کا ثبوت ہے۔ تمام قرآن امر و نہی اور وعدہ و وعید سے بھرا ہوا ہے۔ کیا کوئی شخص پتھر پر بھی حکم کرتا ہے۔ کیا کوئی دانا پتھر یا مٹی کے ڈھیلے پر غصہ کرتا ہے؟ ماسوائے خدا کے اگر کسی شخص کو اختیار نہ ہو تو تجھے قصور وار آدمی پر غصہ کیوں آئے۔ اگر چھت سے کوئی لکڑی ٹوٹ کر تجھ پر گرے اور تجھے زخمی کر دے تو کیا تجھے لکڑی پر غصہ آسکتا ہے —! مولانا رومی فرماتے ہیں:

این کہ فردا آں کنم یا ایں کنم — ایں دلیلِ اختیار است اے صنم
واں پشیمانی کہ خوردی زاں بدی — ز اختیار خویش گشتی مہتدی
جملہ قرآں امر و نہی است و وعید — امر کردن سنگِ مرمر را کہ دید؟
ہیچ دانا ہیچ عاقل ایں کند — با کلوخ و سنگ خشم و کیں کند!
غیر حق را گر نباشد اختیار — خشم چوں می آیدت بر جرم دار؟
گر ز سقفِ خانہ چوبے بشکند — بر تو افتد سخت مجروحت کند

ہیچ خشمے آیدت بر چوبِ سقف
ہیچ اندر کیں او باشی تو وقف!

اِسی مسئلہ کو جاوید نامہ میں اقبال نے اس طرح بیان کیا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے ہماری فطرت، ہمارے اقتضا، ہماری قابلیت کے مطابق ہو رہا ہے۔ انسان نے اپنی خودی اور اپنے جوہر کو بھلا دیا ہے اور نکتۂ تقدیر کو وہ ابھی تک سمجھ نہیں سکا ہے۔ تقدیر کا راز صرف اتنا ہے کہ تو اگر بدل جائے تو تیری تقدیر بھی بدل سکتی ہے۔ اگر تو مٹی ہو جائے تو ہوا تجھے اُڑا لے جاتی ہے، پتھر بن جائے تو تجھ سے شیشہ کے توڑنے کا کام لیا جاتا ہے اور اگر شبنم ہو جائے تو تیرے حصّہ میں

بجز افتادگی کے کچھ نہیں رہتا — لیکن سمندر کی صورت اختیار کرے تو دوام تجھے نصیب ہو سکتا ہے —!

ارضیاں نقدِ خودی دریافتند — نکتۂ تقدیر را نشناختند
رمزِ باریکش بہ حرفے مضمر است — تو اگر دیگر شوی، او دیگر است
خاک شو، نذرِ ہوا سازد ترا — سنگ شو، بر شیشہ اندازد ترا!

شبنمی؟ افتندگی تقدیرِ تست
قلزمی؟ پائندگی تقدیرِ تست

فطرت کی عکاسی

ورڈسورتھ فطرت کی عکاسی کے ماہر سمجھے جاتے ہیں ان کی نظم "ویسٹ منسٹر برج پر" بطور مثال پیش کی جاتی ہے۔ وہ نظم یہ ہے:-

Earth has not any thing to show more fair :
Dull would he be of soul who could pass by
A sight so touching in its majesty ;
This city now doth like a garment wear
The beauty of the morning : silent, bare,
Ships, towers, domes, theatres, and temples lie
Open unto the fields, and to the sky,
All bright and glittering in the smokeless air.
Never did sun more beautifully steep
In his first splendour Valley, rock, or hill ;

Never saw I, never felt, a calm so deep !
The river glideth at his own sweet will :
Dear God ! the very houses seem asleep ;
And all that mighty heart is lying still !

اقبال کی منظر کشی کو ورڈسوزتھ کے آرٹ کے مقابلہ میں نہایت فخر کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔ وہ الفاظ کے ذریعے فطرت کی ایسی تصویر کھینچتے ہیں کہ حقیقت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اُن کی نظم "کشمیر" اُن کی سحر نگاری کا ایک عجیب نمونہ ہے ـــــ!

رخت باکاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں ببیں لالہ چمن چمن نگر

بادِ بہار موج موج مُرغِ بہار فوج فوج
صلصل و سار زوج زوج بر سرِ نارون نگر

لالہ زخاک بردمید موج بآبجو تپید
خاک شرر شرر ببیں آب شکن شکن نگر،

زخمہ بہ تارِ ساز زن بادہ بہ ساتگیں بریز
قافلۂ بہار را انجمن انجمن نگر

اقبال تجریدی تصوّرات کو ٹھوس شکل میں پیش کرتے ہیں اور الفاظ کے طلسم سے بے جان اشیاء میں روح پھونک کر اُن کے ذریعے اپنا پیام دنیا والوں تک پہنچادیتے ہیں۔ اُن کی نظم "بزمِ انجم"، اَدبی مصوّری کا ایک انوکھا نمونہ ہے ـــــ!

سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو
طشتِ افق سے لیکر لالے کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور،
قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے

چمکے عروسِ شب کے موتی وہ پیارے پیارے ــــــــ محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی

وہ دور رہنے والے ہنگامۂ جہاں سے

کہتا ہے جن کو انساں اپنی زباں میں تارے

ورڈسورتھ اپنی محولہ بالا نظم میں کہتے ہیں کہ شہر صبح کے حسن کو اِس طرح زیبِ تن کئے ہوئے ہے جیسے کہ وہ اس کا لباس ہے ــــــ اور اقبال کہتے ہیں کہ شام کے وقت عروسِ فطرت چاندی کا گہنا اتار لیتی ہے کیونکہ شفق اُسے سونے کا گہنا پہنا دیتی ہے۔ اور پھر رات خاموشی کے محمل میں سوار ہو کر چلی آتی ہے۔!

اپنی نظم "ایک شام" میں دریائے نیکر کا منظر پیش کر کے اُس کی خاموشی کی اِس طرح تصویر کھینچتے ہیں۔

شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی ــــــــ خاموش ہے چاندنی قمر کی

کہسار کے سبزہ پوش خاموش ــــــــ وادی کے نوا فروش خاموش

فطرت بے ہوش ہو گئی ہے،

آغوش میں شب کے سو گئی ہے

ورڈسورتھ اپنی اُس نظم میں جس کا ذکر اوپر آیا ہے خاموشی کو اِس طرح بیان کرتے ہیں کہ اے خدا! ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خود مکانات ہی سو رہے ہیں اور طاقتور قلب (شہر لندن) خاموش پڑا ہوا ہے ــــــ لیکن اقبال کے تاثر کو دیکھئے کہ اُن کے نزدیک خاموشی اس قدر اثر آفریں ہے کہ اُس کے اثر سے خود فطرت ہی بے ہوش ہو کر شب کے آغوش میں سو گئی ہو ــــــ!!

غزل اقبال کی غزلیں اُن کی زندہ دلی اور شخصی واردات کا عکس ہیں۔ زندگی

اُن کا موضوع ہے اور روزمرّہ وارداتوں کو وہ جذبات کی شکل دے کر اثر پیدا کرتے ہیں۔ کشمکش کی تعلیم، نصب العین کی تخلیق، جدت اور اچھوتا پن اُن کی غزلوں کی نمایاں خصوصیات ہیں جو کسی طرح حافظ اور شیلے کی غزلوں سے کم نہیں ہیں۔

حافظؔ کی ایک غزل ہے:۔

ساقی بنور بادہ برافروز جامِ ما　　　مطرب بگو کہ کارِ جہاں شد بکامِ ما
ما در پیالہ عکسِ رُخِ یار دیدہ ایم　　　اے بے خبر زلذّتِ شرب مدامِ ما
ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق　　　ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

حافظؔ زدیدہ دانۂ اشکے ہمی فشاں
باشد کہ مُرغِ وصل کند قصدِ دامِ ما

اور اقبال کی ایک غزل ملاحظہ ہو:۔

فصلِ بہار ایں چنیں، بانگِ ہزار ایں چنیں　　　چہرہ کشا، غزل سرا، بادہ بیار ایں چنیں
اشکِ چکیدہ ام ببیں ہم بہ نگاہِ خود نگر،　　　ریزہ بہ نیستانِ من برق و شرار ایں چنیں
بادِ بہار را بگو پے بہ خیالِ من برد　　　وادی و دشت را دہد نقش و نگار ایں چنیں
زادۂ باغ و راغ را از نفسم طراوتے　　　در چمنِ تو زیستم باگل و خار ایں چنیں،
عالمِ آب و خاک را بر محکِ دلم بسائے　　　روشن و تار خویش را گیر عیار ایں چنیں
دِل بکسے نباختہ باد و جہاں نساختہ!　　　من بحضورِ تو رسم، روزِ شمار ایں چنیں

فاختۂ کہن صفیر نالۂ من شنید و گفت
کس نہ سرود در چمن نغمۂ یار ایں چنیں

اقبال کی اس غزل میں حافظؔ کا ترنم موجود ہے۔ اور ساتھ ہی نظیری کا ذہن رسا

اور میر کا سوز و ساز بھی اس میں ہے۔ نیز روح و شکل کا ایسا امتزاج پایا جاتا ہے کہ جس سے ذوقِ لطیف کو تازگی اور فرحت نصیب ہوتی ہے۔ وہ اپنی غزل میں محبت کی صرف رسمی گفتگو ہی نہیں کرتے بلکہ اس کی اعلیٰ ترین غرض کی وضاحت کرتے ہوئے اپنا بیش بہا پیام بھی سننے والے کے ذہن نشین کر دیتے ہیں۔!

بعض ناقدین کہتے ہیں کہ آخری زمانہ میں اقبال کی غزلوں میں آمد نہیں رہی تھی جس کے باعث شعر میں کشش کا فقدان ہو گیا تھا۔ یہ تنقید ایک حد تک درست ہے۔ لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ اس دور میں عارفانہ واردانوں کے اظہار کے لئے صحیح الفاظ کی انھیں تلاش رہی جو اکثر موقعوں پر انھیں دستیاب نہ ہو سکے۔ چنانچہ اُنھوں نے نئے الفاظ اور اصطلاحات کی تشکیل شروع کی اور زبان و ادب کی قدیم پابندیوں اور روایات کو نظر انداز کر دیا۔ بالِ جبریل کے مندرجہ ذیل اشعار سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے۔

مٹا دیا مرے ساقی نے عالمِ من و تو ‏ ‏ پلا کے مجھکو مئے لا الٰہ الا ھو
نہ مئے نہ شعر نہ ساقی نہ شورِ چنگ و رباب ‏ ‏ سکوتِ کوہ و لبِ جوئے و لالۂ خودرو
گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ ‏ ‏ پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو
جمیل تر ہیں گل و لالہ فیض سے اس کے
نگاہِ شاعرِ رنگیں نوا میں ہے جادو

حُسن و عشق کے عناصر اقبال کی غزل گوئی میں پائے جاتے ہیں۔ وحدت الوجود کے نظریہ کے وہ سخت مخالف ہیں اور اقوامِ مشرق کے زوال کا اِسے سبب قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے حافظ کے مسلک کی بھی شدید مخالفت

کی ہے — حسن وعشق کا موضوع اُن کے کلام کا ایک نہایت لطیف اور اہم پہلو ہے۔
اُن کی نگاہ میں کائناتِ فطرت کا ہر مظہر حسین ہے۔ ہر شے میں اُنھیں حسن نظر آتا ہے
لیکن ایسا حسن جو قوت اور ارتقاء کا موجب ہو انہیں بے انتہا پسند ہے ——
فی الحقیقت حسن ایک ذہنی واردات ہے۔ وہ اشیاء کی خصوصیت نہیں ہے
اقبال کا تصور یہ ہے کہ الیغوئے مطلق (U LT. E g o) سب سے زیادہ حسین ہے
اور ہر طاقتور چیز اسی ایغوئے مطلق کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اقبال کا یہ تصور جو
اُن کی غزل کو توانائی اور جرأت بخشتا ہے میرؔ، صائبؔ، خسروؔ، حافظ اور سعدیؔ کے
ہاں موجود نہیں ہے۔ اقبال کو بلبل اور قمری کے مقابلہ میں عقاب اور شاہین کا
حسن زیادہ پسند ہے!

اقبال کا تصورِ عشق فارسی اور اردو کے قدیم شعراء کے تصور سے مختلف ہے
البتہ رومیؔ کے کلام سے اس خصوص میں بھی اُنہوں نے فیض حاصل کیا ہے۔ ان کے
نزدیک عشق نہ صرف تمام دشواریوں کا حل ہے بلکہ تمام بیماریوں کا علاج بھی ہے
یہ کائنات کے تمام عناصر میں اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کرتا ہے اور ایک اضطراری
کیفیت پیدا کر کے زندگی کو قابلِ برداشت بنا دیتا ہے ——!

من بندۂ آزادم عشق است امامِ من عشق است امامِ من، عقل است غلامِ من
اے عالمِ رنگ و بو ایں صحبتِ ما تا چند مرگ است دوامِ تو، عشق است دوامِ من

عشق اعلیٰ ترین اقدار کے لیے جرأت اور بلند حوصلگی پیدا کرتا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

فارسی اور اردو کے اکثر شعراء کی غزلوں میں خامیاں پائی جاتی ہیں۔ کہیں عنوان میں ہم آہنگی نہیں ہوتی تو کہیں شعر میں حقیقت اور خلوص کا فقدان ہوتا ہے محبّت پر اظہارِ خیال تو کیا جاتا ہے لیکن شاعر عملاً نہیں جانتا کہ محبت کی اصلیت کیا ہے۔ تصوّف کو اگرچہ جگہ دینے کی کوشش کی گئی ہے لیکن صوفیانہ حقیقت کا رنگ بہت کم شعراء کے کلام میں پایا جاتا ہے کیونکہ عارفانہ وارداتوں سے عام شاعروں کو دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ نیز اکثر غیر فطری عناصر غزل میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔ مثلاً معشوق کو ظالم، جابر، دغاباز اور فریبی کہا جانے لگا ہے ظاہر ہے کہ محبّت کی پاکیزگی اور لطافت سے اِن باتوں کو کوئی واسطہ نہیں ہے — اقبال کی غزلیں اِن خامیوں سے بالاتر ہیں اور وہ محبت کو ایک مقدس، لطیف اور ہمہ گیر قوّت سمجھتے ہیں —!

صورت نہ پرستم من، بتخانہ شکستم من — آں سیلِ سبک سیرم، ہر بند گسستم من

در بود و نبودِ من اندیشہ گمانہا داشت — از عشق ہویدا شد ایں نکتہ کہ ہستم من

در دیر نیازِ من، در کعبہ نمازِ من

زنّار بدوشم من، تسبیح بدستم من

درد آفرینی

کسی کیفیت کو بیان کرنے کے لئے اقبال خود اُس کے اندر ڈوب کر اُس کی ماہیّت کو محسوس کرتے ہیں اور پھر مؤثر الفاظ کے ذریعے اُس کی ایسی تصویر کھینچتے ہیں کہ خود پڑھنے والے پر بھی وہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ان کے مرثیہ میں درد آفرینی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے جو توقّت واحد عبرت انگیز بھی ہوتا ہے اور زندگی کے المیّہ کی حقیقت کا اظہار کر کے عقدۂ فنا کو

حل بھی پیش کرتا ہے — گرے نے ایک قبرستان کا منظر پیش کرتے ہوئے کہا ہے:۔

Yet even these bones from insult to protect,
Some frail memorial still erected nigh,
With uncouth rhymes and shapeless sculpture decked,
Implores the passing tribute of a sigh.

اقبال نے "گورستانِ شاہی" کے عنوان کے تحت لکھا ہے:۔

سوتے ہیں خاموش، آبادی کے ہنگاموں سے دور
مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوئے ناصبور،
قبر کی ظلمت میں ہے ان آفتابوں کی چمک
جن کے دروازوں پہ رہتا تھا جبیں گستر فلک
کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل
جن کی تدبیرِ جہاں بانی سے ڈرتا تھا زوال،
رعبِ فغفوری ہو دنیا میں کہ شانِ قیصری
ٹل نہیں سکتی غنیمِ موت کی یورش کبھی
بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور
جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور
شورشِ بزمِ طرب کیا! عود کی تقریر کیا
دردمندانِ جہاں کا نالۂ شبگیر کیا!

عرصۂ پیکار میں ہنگامۂ شمشیر کیا!
خون کو گرمانے والا نعرۂ تکبیر کیا!
اب کوئی آواز سوتوں کو جگا سکتی نہیں،
سینۂ ویراں میں جانِ رفتہ آسکتی نہیں

گرے کا موضوع گورِ غریباں ہے اور اقبال کا گورستانِ شاہی لیکن دونوں میں ایک گہری کیفیت موجود ہے جس سے دل میں کسک پیدا ہوتی ہے اور اِس دارِ فانی کے عارضی اور زوال پذیر ہونے کا احساس شدید ہو جاتا ہے۔ گرے کی یہ نظم شاعری کی صنفِ مرثیہ کا ایک بیش بہا موتی ہے جو موت کی قہاری، مرنے والے کی مجبوری اور چاہنے والے کی بے بسی کی ایک عبرت آموز تصویر ہمارے سامنے رکھدیتی ہے۔ وہ کہتا ہے۔

On some fond breast the parting soul relies,
Some pious drops the closing eye requires;
Even from the tomb the voice of Nature cries,
Even in our ashes live their wonted fires.

اب اقبال کے کلام میں موت کی قہاری کو دیکھیے۔ اپنی نظم میں جو اُنھوں نے اپنی والدہ مرحومہ کی یاد میں لکھی ہے وہ کہتے ہیں:۔

کلبۂ افلاس میں، دولت کے کاشانے میں موت،
دشت و در میں، شہر میں، گلشن میں ویرانے میں موت
موت ہے ہنگامہ آرا قلزمِ خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں

نے جمالِ شکوہ ہے، نے طاقتِ گفتار ہے
زندگانی کیا ہے، اِک طوقِ گلو افشار ہے،

قافلے میں غیر فریادِ درا کچھ بھی نہیں
اِک متاعِ دیدۂ تر کے سوا کچھ بھی نہیں

اور چاہنے والے کی حسرت انگیز لاچاری کا وہ اس طرح ذکر کرتے ہیں:۔

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ! میرا انتظار!
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بیقرار،

خاکِ مرقد پر تری لیکر یہہ فریاد آؤنگا
اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤنگا؟

گرے کے ہاں صرف دردآفرینی ہے۔ اُس نے موت کے عقدہ کا کوئی حل دنیا کو نہیں دیا ہے۔ اِس کے برعکس اقبال کہتے ہیں کہ موت انسان کے جوہر کو فنا نہیں کر سکتی کیونکہ یہہ منشائے قدرت نہیں ہے۔ زندگی کا تحفظ فطرت کی مصلحت میں شامل ہے اور موت کے بعد ایک ایسی زندگی کی ابتدا ہوتی ہے جو بہت پائیدار اور عظیم الشان ہے ——!

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں ٹوٹنا جس کا مقدر ہو، یہہ وہ گوہر نہیں
زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات

اور

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

خوگرِ پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں!
موت اِس گلشن میں جز سنجیدنِ پر کچھ نہیں!

اور

جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے، فنا ہوتا نہیں

مسلک اقبال کی شاعری کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ وہ رمزیت (Symbolism) رومانیت (Romanticism) اور کلاسکیت (Classicism) کا ایک خوشگوار امتزاج ہے۔ مشرقی زبان میں رمزیت اور رومانیت عہدِ قدیم سے پائے جاتے ہیں۔ لیکن یورپ نشاۃ ثانیہ کے بعد اِن سے روشناس ہوا۔ رمزیت وہ اسلوبِ بیان ہے جس میں خیالات کو عُریانی میں پیش کرنے کی بجائے اشارہ وکنایہ کے ذریعے ظاہر کیا جاتا ہے۔ مولانا رومی فرماتے ہیں کہ

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں،

اور اقبال کہتے ہیں کہ

برہنہ حرف نگفتن کمالِ گویائی است
حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

رمزیت شاعر کے مشاہدات میں اثر پیدا کرتی ہے اور شعر کو معنی اور قوّت عطا کر کے سننے والے کو بھولی ہوئی باتیں یاد دلاتی ہے۔ اقبال کو رمزیت پر مکمّل قدرت حاصل ہے اور وہ اشاروں وکنایوں میں گہرے اور پیچیدہ مسائل کو

اِس طرح بیان کرتے ہیں کہ اس کی مثال ملنا دشوار ہے۔ رومانیت میں مادی قدروں پر روحانی اور وجدانی قدروں کو ترجیح دی جاتی ہے اور زندگی کے دائرہ کو تخیل کے زور سے وسیع تر کر کے ذہن کے لئے میدانِ عمل فراہم کیا جاتا ہے۔ نیز اِس میں تجریدی تخیل کو خارجی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

کلاسکیت ایک غیر جذباتی اسلوبِ بیان ہے۔ فصاحت، ثقہ پن، تکلف اور حد بندی اِس کی خصوصیات ہیں — لیکن اقبال کے کلام میں رومانی جوش کلاسکی انداز میں محسوس ہوتا ہے جو اُن کی شاعری کی عظمت کا راز ہے اُن کے نزدیک زندگی میں ترقی کے غیر محدود امکانات ہیں۔ اِس لئے شاعر کا تخلیقی جوہر بھی غیر محدود ہونا چاہیئے۔ چنانچہ وہ اپنے دِل کی گہرائیوں سے اپنی نئی دُنیا کو نکال کر حُسن کارانہ انداز میں انسان کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اُسے تخلیق کی مسلسل دعوت دیتے ہیں۔

فروغِ آدمِ خاکی ز تازہ کاری ہاست　　مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند

وہ اپنی نئی دنیا میں نظامِ جدید قائم کرنا چاہتے ہیں اور اپنے انہماک میں خدا کو چیلنج کرتے ہیں کہ

گفت یزداں کہ چنیں است و دگر ہیچ مگو
گفت آدم کہ چنیں است و چناں می بائیست

لیکن رومانی شاعری میں بھٹک جانے کا خطرہ ہمیشہ لاحق رہتا ہے۔ بسا اوقات شاعر اخلاقی اور بنیادی قدروں سے متجاوز ہو کر اپنے تخیل کی بے راہروی کو جذبہ اور وجدان سمجھنے لگتا ہے — ایسے ہی موقع پر کلاسکیت ایک روک کا

کام کرتی ہے تاکہ عظیم ترین تخلیقی جدوجہد میں بھی شاعر زندگی کے حقائق سے دور نہ ہو سکے۔

اقبال کی نظم "تسخیر فطرت"، رومانیت اور کلاسکیت کے امتزاج کا بہترین نمونہ ہے۔ اس نظم میں آدم کے جنت سے نکالے جانے اور شیطان کے تعمیل حکم سے انکار کا ذکر ہے۔ شیطان کا کردار رومانی ہے جو عمل اور جوشش میں اعتقاد رکھتا ہے۔ والٹر کے نزدیک شیطان سے مراد ہی وہ انسانی صفات ہیں جو جذبات کی شکل میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ والٹر سے ایک طویل عرصہ قبل سرورِ کائنات نے بھی یہی فرمایا ہے کہ شیطان انسان کے اندر خون کی طرح گردش کرتا رہتا ہے۔ یعنی انسانی جذبات کی تخلیقی قوت کا دوسرا نام شیطان ہے۔ ان جذبات کو راہِ راست پر لانا تمام ادیانِ عالم کا مقصود ہے کیونکہ جہاں جذبات کی بے راہ روی سے زندگی میں فساد پیدا ہوتا ہے وہاں ان کے صحیح استعمال سے انسانی سیرت ترقی کرتی ہے اور زندگی حقیقت سے قریب تر ہوتی جاتی ہے ۔۔ اس سے ظاہر ہے کہ شیطان کے معتوب ہونے کا سبب اُس کی باغی عقل ہے جو اُسے ضبطِ نفس سے باز رکھتی ہے جس کے باعث اُس کا تمام زاویۂ نظر ہی بدل جاتا ہے۔ انکار اُس کے کردار کی بنیاد ہے، عشق اور یقین کے عناصر سے محرومی اُس کی بے راہ روی کا سبب ہے اور اُس کی زندگی کا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنی تقدیر کو بدل دینے پر قادر نہیں ہے۔ جب آدم کے سامنے سجدہ کے لئے خدا اُسے حکم دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں آگ سے اور آدم مٹی سے بنے ہیں، پھر یہ فتنہ انگیز دعویٰ کرتا ہے کہ کائنات کی رگوں میں میرے ہی وجود سے گرمی ہے، میں ستاروں کو گردش، دنیا کو زندگی اور تیری مخلوق کو شور و ہیجان بخشتا ہوں،

اِس لئے آدم کو جو کم نظر و تنگ مایہ ہے سجدہ کرنا میرے لئے توہین کا موجب ہے ——!

نوریٔ ناداں نیم، سجدہ بہ آدم برم — او بہ نہاد است خاک، من بہ نژاد آذرم
می تپد از سوزِ من، خون رگِ کائنات — من بہ دوصرصرم، من بہ غو تندرم
پیکرِ انجم ز تو، گردشِ انجم ز من — جاں بہ جہاں اندرم، زندگیٔ مضمرم
من ز تنک مایگاں، گر بہ نکردم سجود — قاہرِ بے دوزخم، داورِ بے محشرم
تو بہ بدن جاں وہی، شور بجاں می دہم — تو بہ سکوں رہزنی، من بہ تپش رہبرم[1]

آدمِ خاکی نہاد، دوں نظر و کم سودا
زاد در آغوشِ تو، پیر شود در برم

اِس سجدہ کے نہ کرنے سے جب شیطان معتوب ہو جاتا ہے تو وہ آدم کو جنّت سے نکلوانے کی ترکیب کرتا ہے۔ وہ آدم کو بتاتا ہے کہ بہشت کی پرسکون زندگی میں احساسات اور جذبات کی تخلیق ناممکن ہے جن کے بغیر حیات بےکیف اور بے رنگ رہتی ہے۔

زندگیِ سوز و ساز، بہ ز سکونِ دوام — فاختہ شاہیں شود، از تپشِ زیرِ دام
ہیچ نیاید ز تو غیر سجودِ نیاز — خیز چو سروِ بلند، اے بعملِ نرم گام

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیاتِ دوام، سوختنِ ناتمام

آدم شیطان کے مشورہ پر عمل کر کے بہشت سے نکل جاتے ہیں اور زندگی کے سوز و ساز اور جہانِ آب و خاک کے شور و غل میں مسرّت محسوس کرتے ہیں جس سے

---

[1] مندرجہ بالا خیالات اقبال کے اپنے ہیں۔ کلام مجید کی آیات سے ان کی تائید نہیں ہوتی۔ نیز دوسری طرف اقبال جوشش و حرکت اور زندگی کی دلچسپیوں کو "عشق" کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اور "عشق" شیطان کی ضد ہے۔

نئی آرزوؤں کی تخلیق ہوتی ہے۔اُن کی تدریں بدل جاتی ہیں، عقیدت شبہ کا رنگ حاصل کرتی ہے اور سکون تجسّس کی جگہ لے لیتا ہے، اقبال اِس شگفتہ صورتِ حال کی مناسبت سے اپنی نظم کی بحر بدل کر اِس طرح موتی پروتے ہیں :-

چہ خوش است زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن
دلِ کوہ و دشت و صحرا بہ دمے گداز کردن

ہمہ سوزِ ناتمامم، ہمہ درد آرزویم
بگماں وہم یقیں را کہ شہیدِ جستجویم

آدم بالآخر خدا کے سامنے پیش ہو کر کہتے ہیں کہ اگرچہ میں اپنی بے راہروی پر نادم ہوں لیکن شیطان کے فسوں کے تجربے کے بغیر میری زندگی نامکمّل رہتی -!

آدم کی یہ معذرت اور ندامت اُنہیں اشرف المخلوقات کا درجہ اور شیطانی وسوسوں پر غلبہ عطا کرتی ہے۔ خدا سے وہ کہتے ہیں کہ

گرچہ فسونش مرا بُرد ز راہِ صواب
از غلطم درگذر، عذرِ گناہم پذیر

تا نشود از آہِ گرمم ایں بُتِ سنگیں گداز
بستنِ زنّارِ او بود مرا ناگزیر

عقل بدامم آورد فطرتِ چالاک را
اہرمنِ شعلہ زاد سجدہ کند خاک را

اقبال کی ایک اور نظم میں رومانیت اور کلاسکیت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔اِس نظم کے تین حصّے ہیں، "لینن"، "فرشتوں کا گیت"، اور "فرمانِ خدا"، لینن جو اپنی زندگی میں خُدا کا منکر تھا یکایک خدا کے سامنے جب آجاتا ہے تو اُس کے حدسے انکار کی جرات اُسے نہیں ہوتی - لہٰذا وہ خدا سے پوچھتا ہے کہ تو کس کا

معبود ہے؟ —— مشرق میں تو سفید اقوام خدا بنی ہوئی ہیں اور مغرب کا خدا وہاں کی دولت ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دنیا میں نکبت، فلاکت اور پریشانی عام ہے۔ تو منصف مزاج تو ہے لیکن تیری دُنیا میں محنت کشوں کی زندگی سرمایہ داری کی وجہ سے بہت تلخ اور سخت تکلیف دہ ہو گئی ہے۔ یہ سرمایہ داری جو انسانی مصائب میں اضافہ کرتی جا رہی ہے کب ختم ہونے والی ہے اور روزِ حشر کب آنیوالا ہے جس کا انتظار دُنیا بڑی سختی سے کر رہی ہے —— ! لینن کی اِس گفتگو سے فرشتے متاثر ہوتے ہیں اور کورس کی صورت میں خدا کو متوجہ کرتے ہیں کہ اس کی دنیا کا نظام ابھی ناتمام ہے۔ ابھی سے اُس کی اصلاح اور درستی کی ضرورت ہے —— خدا فرشتوں کے اس بیان سے اثر لیتا ہے اور اُنہیں حکم دیتا ہے کہ غریبوں کو خوابِ غفلت سے جگا کر اُن کی قدروں کو بدل دو اور اُس معاشرہ کی بنیادوں کو ہلا دو جو عدمِ مساوات اور ظلم پر قائم ہے۔ لینن خُدا سے کہتا ہے:۔

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات

میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیّر تھے خرد کے نظریات

آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت
میں جسکو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات

اک بات اگر مجھکو اجازت ہو تو پوچھوں
حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات

وہ کونسا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود
وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات!

مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات!

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبّر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات!

چہروں پہ جو سُرخی نظر آتی ہے سرِ شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات!

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

لینن کی اس گفتگو پر فرشتے گانے لگتے ہیں:۔

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گرِ ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی،

خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر،
تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی

اس پر خداوندِ عالم فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ:۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو،

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

اس نظم میں لینن کا کردار رومانی ہے۔ وہ پریشان ہے اور کچھ معلوم کرنا چاہتا ہے۔ ایسی صورت میں اقبال پر کلاسکیت کا اثر نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ لینن سے کچھ زبان درازی ہو جاتی۔ لیکن پوری نظم کلاسکی اثرات کے باعث حدود اعتدال سے متجاوز نہ ہو سکی۔ نیز فرشتوں کے گیت میں ملکوتی موسیقی کی عظمت ہے اور خدا کا حکم اُس کی برتری اور جلال و جبروت کا آئینہ دار ہے ۔۔۔!

تجسس شاعری کی عظمت کا ایک قیمتی جوہر ہے۔ اُسے ایک خوبصورت

پھول دے دیجئے، وہ زیادہ خوبصورت پھول کا آرزومند ہو جائے گا۔ محدود اور مطلق اُسے صرف عارضی سکون بخش سکتے ہیں۔ اس لئے وہ ہمیشہ غیر مطلق اور غیر محدود کی تلاش میں رہتا ہے ـــــ یہ دُنیا اپنے تمام حسن و جمال اور ساری لطافتوں اور عظمتوں کے باوجود شاعر کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ وہ اپنے الفاظ کی سحر آفرینی سے ایک زیادہ حسین اور زیادہ قیمتی دنیا کی تخلیق کر سکتا ہے۔ وہ حُسن کا عاشق اور حُسن کا خالق ہوتا ہے۔ اور ایک حقیر شئے کو گراں قدر اور حیرت انگیز بنا سکتا ہے۔ فطرت کے ہر منظر اور ہر نغمے میں فضیلت دیکھتا ہے جو بر و بحر کی پہنائیوں میں عام انسانوں کو نظر نہیں آسکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے شاعر کو فطرت سے روحانی لگاؤ ہوتا ہے، حُسن کے لئے محبت اور زندگی کے لئے طلبِ صادق اُس کے دل میں موجود ہوتی ہے ـــــ!

اقبال کے کلام میں بھی ایک پاکیزہ طلب موجود ہے۔ وہ زندگی کی کسی چیز پر قانع نہیں ہیں۔ وہ اُس شئے کے حصول کے لئے کوشاں ہوتے ہیں جو نا قابلِ حصول ہوتی ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ کسی چیز کے حاصل ہو جانے سے سکوت لازم آتا ہے ـــ بہشتِ بریں کا حصول بھی شاعر کے لئے پیامِ موت ہوتا ہے، اس کے دل میں اُبھرتا ہوا شعلہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے، سوزِ دروں فنا ہو جاتا ہے! لہٰذا زندگی کے لئے منزل سے دوری ہی مناسب ہے اور بقائے حیات کے لئے کبھی نہ ختم ہونے والا سفر ہی ضروری ہے! چنانچہ اپنی نظم "سرودِ انجم" میں اقبال اسی فلسفۂ حیات کو پیش کرتے ہیں اور ہمارے خوابیدہ احساسات کو بیدار کر کے صحتمند زندگی کے دھارے پر ڈال دیتے ہیں۔

ہستیٔ ما نظامِ ما مستیٔ ما خرامِ ما

گردشِ بے مقامِ ما زندگیٔ دوامِ ما

دورِ فلک بکامِ ما می نگریم و می رویم

پیشِ تو نہ دِ با کمے سالِ تو پیشِ ما دمے

اے بکنارِ تو یمے ساختۂ بہ شبنمے

ما بتلاشِ عالمے

می نگریم و می رویم

اپنی ایک اور رومانی نظم "حدی" کے ذریعے اقبال نے ملّت میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کی ہے۔ اس نظم میں نزاکتِ شعری کے علاوہ ترنّم اور موسیقیت بدرجۂ کمال موجود ہیں۔۔۔ ایک بدو کا اونٹ اس کے لئے سب کچھ ہوتا ہے۔ ریگستان کی پہنائیوں میں وہ اُس کا دوست اور تنہائیوں میں اس کا مونس و غمخوار ہوتا ہے۔ سفرِ حیات میں اونٹ کی یہہ رفاقت جانبین میں ایسے جذبات کی تخلیق کرتی ہے جو بہت پاکیزہ اور بہت گہرے ہوتے ہیں۔ اس کیفیت کے اظہار کے لئے اقبال کا طریقۂ بیان بڑا معنی خیز ہے۔۔ حدی کا نغمہ جس طرح اُس کے مصائب کو بھلانے اور اُس کے رفیق کی تکان کو کم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اُسی طرح شاعر کا یہ نغمہ بھی محنت کی عظمت کے بیدا کرنے اور قوم کی حوصلہ افزائی کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ حدی کہتا ہے:۔

ناقۂ سیّارِ من

آہوئے تاتارِ من

درہم و دینارِ من
اندک و بسیارِ من
دولتِ بیدارِ من
تیز ترک گامزن منزلِ ما دور نیست
دلکش و زیبا ستی
شاہدِ رعنا ستی
روکشِ حورا ستی
غیرتِ لیلا ستی
دخترِ صحرا ستی
تیز ترک گامزن منزلِ ما دور نیست

اجزائے ترکیبی

اقبال کی شاعری کئی بیش بہا عناصر سے مرکب ہے۔ لیکن "تخیل"، فطرت نگاری، جدت اور فصاحت اُس کے اہم اجزائے ترکیبی سمجھے جا سکتے ہیں۔

تخیل شاعر کا جوہر ہوتا ہے جس سے وہ ہر کیفیت میں معنی پیدا کر
ور ذہنی و روحانی تصورات کو مناسب انداز میں اہلِ جہاں کے سا
ہے۔ تخیل کی دو قسمیں سمجھی جاتی ہیں۔ تلازمی اور تعبیری۔ اقبال کے
قسمیں موجود ہیں۔ اُن کی نظم "تنہائی"، تلازمی تخیل کی بہ
کے شاعروں نے تنہائی پر اظہارِ خیال کیا ہے لیکن
میں اُتر جاتا ہے ــــ!

بہ بحر رفتم و گفتم بہ موجِ بیتابے   ہمیشہ در طلب استی چہ مشکلے داری؟
ہزار لولوئے لاست در گریبانت   درونِ سینہ چو من گوہر دلے داری؟
تپید و از لبِ ساحل رمید و ہیچ نگفت

مگر آرٹ اور مسلک کے امتزاج کا یہ عروج ہے کہ اس مشکل مضمون میں بھی دِل کی بات شاعر کہہ ہی جاتا ہے اور کیا خوب کہتا ہے۔

شدم بحضرتِ یزداں گذشتم از مہ و مہر   کہ در جہانِ تو یک ذرہ آشنایم نیست
تر ،: ۱ ، و مشتِ خاکِ من ہمہ دل   چمن خوش است و لے درخور نوایم نیست
ہیے نگفت

جذبہ اور تخیّل میں گہرا تعلق ہے۔ جذبہ کی شدّت تخیّل آفریں ہوتی ہے اور تخیّل سے جذبہ کی تخلیق ہوتی ہے۔ یعنی اعلیٰ و ارفع تخیّل نیک اور پاکیزہ جذبات کو جنم دیتا ہے۔ اقبال کا تخیّل صالح ہے اور یہ خصوصیت اقبال کو اردو کے اکثر ایسے شعراء سے ممیز کرتی ہے جن کی جذبات نگاری میں بے راہروی صاف نظر آتی ہے۔

جو آرٹسٹ فطرت سے مغلوب ہوتا ہے وہ اپنی موت کو آپ دعوت دیتا ہے۔ وہ فطرت کی ایک غیر مکمّل اور بے جان تصویر پیش کرتا ہے۔ اس کے برعکس حقیقی آرٹسٹ اپنی محبّت کے زور سے فطرت کو مغلوب کر کے اُس کی حدود کو وسیع سے وسیع تر کرتا رہتا ہے۔۔۔ وہ فطرت کے خزانوں میں لعل و گہر کا اضافہ کرتا ہے۔ اُس کی تخلیق فطرت کی تخلیق سے زیادہ مکمّل اور زیادہ حسین ہوتی ہے۔ وہ ایک نئی اور طاقتور دنیا کی تخلیق کرتا ہے۔ یہ دنیا اُس کی زندہ اور ابدی روح سے معرضِ وجود میں آتی ہے۔ وہ حُسن و قبح اور خیر و شر پر گہری نظر رکھتا ہے۔ وہ بوقتِ واحد مخرّب بھی ہے اور معمار بھی۔ فرسودہ، بیکار اور بدصورت اشیاء کو وہ تباہ کرتا ہے اور ان کے کھنڈرات پر اپنی نئی دنیا کی تعمیر کرتا ہے!۔۔۔ اقبال کو فطرت کے حسین مناظر سے محبّت ہے وہ فطرت کا مشاہدہ موضوعی اعتبار سے کرتے ہیں۔ اُن کا ذہن موضوع کو پہلے مغلوب کر لیتا ہے اور پھر اُن کی جذباتی کیفیّت اس میں حل ہو کر صفحۂ قرطاس پر منعکس ہو جاتی ہے! وہ کہتے ہیں:۔

صدمہ آ جائے ہوا سے گُل کی پتّی کو اگر　　رشک بن کر میری آنکھوں سے ٹپک جائے اثر

فطرت اُن کے دِل میں شیفتگی اور احساسات میں شگفتگی پیدا کرتی رہتی ہے موسمِ بہار اُنہیں نچلا بیٹھنے نہیں دیتا۔ ابرِ بہار اُنہیں اپنی طرف کھینچتا ہے اور طوطی و درّاج کا ترنّم ان کے سازِ حیات کو چھیڑ دیتا ہے ——!

خیز کہ در کوہ و دشت، خیمہ زد ابرِ بہار
مست ترنّم ہزار
نغمۂ طوطی و درّاج و سار
بر طرفِ جوئبار
کشتِ گُل و لالہ زار
چشمِ تماشا بیار
خیز کہ در کوہ و دشت، خیمہ زد ابرِ بہار

موسمِ بہار کی یہہ کیفیت نہ صرف دلفریب ہے بلکہ اقبال کی دعوتِ کشمکش کی بھی علمبردار ہے۔ جس طرح بہار زندگی اور توانائی بخشتی ہے اُسی طرح اس نظم کے پڑھنے سے بھی طبیعت میں تازگی اور روح میں فرحت محسوس ہوتی ہے۔

اقبال فطرت کو کئی مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ کہیں تمثیلوں اور کنایوں میں اس سے مدد لیتے ہیں، کہیں اشعار کے پس منظر کا اس سے کام لیتے ہیں اور کہیں اپنا پیام دینے سے پہلے پڑھنے والے کو ذہنی طور پہ تیار کرنے کے لئے اس کا استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ساقی نامہ میں فرماتے ہیں:-

فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی اٹکتی، لچکتی، سرکتی ہوئی

اچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی   بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی

ذرا دیکھ اے ساقیٔ لالہ فام

سناتی ہے یہہ زندگی کا پیام

ان اشعار میں اقبال پہلے فرحت بخش فضا اور سرور انگیز کیفیت کو بیان کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ جس طرح کہستانی آبجو دشوار گزار پہاڑوں کو کاٹتی ہوئی آگے بڑھتی ہے اسی طرح انسان کو بھی دشواریوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ارتقائی منزلیں طے کرنی چاہئیں۔

الفاظ الفاظ کے استعمال میں اقبال روایت پسندی کے بالکل خلاف اگرچہ نہیں ہیں تاہم وہ جدید الفاظ اور الفاظ کی ترکیبیں بھی دل کھول کر استعمال کرتے ہیں۔ محاورات کی تشکیل میں وہ بڑی مہارت رکھتے ہیں جس سے اُن کی زبان کی عظمت اور شستگی میں چار چاند لگ جاتے ہیں اور شاعرانہ فیضان کے لئے مستحکم بنیاد بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ زبانِ فارسی میں ایسی اصطلاحات موجود نہیں جن کے ذریعے اقبال اپنے خیالات کا بہتر اظہار کر سکتے تھے۔ لیکن اس زبان کو بھی اُنہوں نے جدید محاورات کی تشکیل اور قدیم محاورات کے ماہرانہ استعمال سے مالا مال کر دیا ہے۔ جدید محاورات ہیں جو اُنہوں نے وضع کئے ہیں: "طائرِ لاہوتی"، "صنم خانۂ پندار"، "کارگہِ شیشہ گراں"، "ضمیرِ کائنات"، اور "حقیقتِ منتظر" بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اور قدیم الفاظ کی چند مثالیں حسبِ ذیل ہیں جو اُن کے کلام میں بہت معنی خیز ہو گئے ہیں۔

قلندر۔ فرہاد۔ پرویز۔ حیدرؓ۔ فاران۔ ایاز۔ محمود۔ خضر۔ لات

آمد یہ کسی شعوری جہد کے بغیر اقبال شعر کہا کرتے تھے۔ ان کی باریک بیں نگاہ مسائل کی گہرائی تک بآسانی پہنچ جاتی تھی اور اسی کی بدولت ان کے شعر میں موسیقیت اور فصاحت پیدا ہوتی تھی۔ اُن کے کلام کی روانی اشعار کے الہامی ہونے کا قیاس قائم کرتی ہے اور خوبصورت الفاظ کے انتخاب اور چست بندشوں کے استعمال سے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ کسی تخیل کا اظہار نہیں ہے بلکہ خود تخیل ہماری آنکھوں کے سامنے رقص کر رہا ہے ——!

اپنی رومانی نظم "حور و شاعر" میں اقبال اپنے فلسفہ کشمکش کو پیش کرتے ہیں۔ ایک شاعر گھومتا ہوا بہشت میں داخل ہوتا ہے لیکن اپنے خیالات کی دنیا میں محو رہتا ہے۔ وہاں کی بے شمار رعنائیاں اُسے اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتیں، یہاں تک کہ ایک حور تنگ آکر اُس سے کہنے لگتی ہے کہ تو عجیب انسان ہے۔ تجھ پر نہ میری دلکشی اثر کرتی ہے اور نہ شراب کی طرف مائل ہوتا ہے۔ دوستی و آشنائی کے سلیقہ سے تو نا آشنا معلوم ہوتا ہے۔ اس پر شاعر جواب دیتا ہے کہ اس مقام کا سکون میرے لئے کوئی کشش نہیں رکھتا۔ تو حسین ضرور ہے لیکن میں جب ایک حسین صورت کو دیکھ لیتا ہوں تو مجھے حسین تر کی تلاش ہونے لگتی ہے۔ اس بہشت کے رہنے والے درد و الم سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں اور اسی سبب سے کسی کے ساتھ ہمدردی کرنا ان کے لئے ممکن ہی نہیں ہے — اس نظم کو پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا حور و شاعر ہماری آنکھوں کے سامنے پر ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں۔!

حور کہتی ہے :-

نہ بہ بادہ میل داری نہ بہ من نظر کشائی
عجب ایں کہ تو نہ دانی رہ و رسم آشنائی
بنوائے آفریدی چہ جہانِ دلکشائے
کہ ارم بچشمم آید چہ طلسم سیمیائی!

شاعر جواب دیتا ہے :۔

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد
دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوب روئے
تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے
سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
دلِ عاشقاں بمیرد بہ بہشت جاودانے
نہ نوائے دردمندے نہ غمے نہ غمگسارے

تنقیدی آرٹ متعدد مرتبہ اقبال نے کہا ہے کہ وہ شاعر نہیں ہیں، بلکہ اپنے فلسفہ اور تصورات کے اظہار کے لئے انہوں نے شاعری کا ذریعہ اختیار کیا ہے، کیونکہ شاعری کے ذریعے کسی تاثر کا پیدا کرنا مقابلتاً آسان ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "میں شاعری نہیں کر رہا ہوں۔ میں آرٹ کے نفیس اور نازک امور سے ناواقف ہوں۔" لہٰذا شاعری کے متعلق اُن کا رویّہ ناقدانہ نہیں ہے۔ اقبال کا اپنا فلسفہ حیات ہے جس کی وہ تبلیغ چاہتے ہیں آرٹ کے

متعلق ان کا تصوّر اُن کے فلسفۂ خودی سے وابستہ اور مربوط ہے۔ شاعری، موسیقی سیاست یا مذہب اُن کے نزدیک اُس وقت مفید ہو سکتے ہیں جبکہ وہ انسانی خودی کے ارتقا میں ممد و معاون ہو سکتے ہوں — لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آرٹ کے تعلق سے اُن کا تصوّر محدود اور اُن کے تصورِ خودی سے مشروط ہے۔

تنقید کے لئے شعر اظہارِ خیال کا مناسب ذریعہ نہیں ہو سکتا کیونکہ شعر میں بغیر کسی قید و بند کے الفاظ کا آزادانہ استعمال ممکن نہیں ہے۔ روزمرہ کی گفتگو میں بھی ہم اظہارِ خیال کے لئے مناسب اور ٹھیک الفاظ استعمال نہیں کرتے ہیں۔ لیکن تنقید کے لئے معیّن اور نپے تلے الفاظ کے ذریعے اظہارِ رائے ضروری ہے۔ اِسی سبب سے بہت کم اشخاص ایسے ملتے ہیں جن کی تنقید واضح اور غیر مبہم ہو نثر میں جہاں اتنی دشواریاں ہیں وہاں شعر کے ذریعے تنقید تو اور مشکل ہو جاتی ہے کیونکہ شعر میں ٹھیک ٹھیک الفاظ کو اتنی اہمیّت نہیں دی جاتی جتنی کہ قافیہ اور ردیف کو دی جاتی ہے۔ ایک خوبصورت لفظ، ایک نیا کنایہ، ایک دلفریب تصوّر شاعر کے لئے زیادہ کشش رکھتا ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ تنقید کی راہ سے ہٹ جاتا ہے۔ یہ صورتِ حال ایک حسین نظم کو تو جنم دے سکتی ہے، لیکن ایسی نظم کو تنقید نہیں کہا جا سکتا— تنقیدی امور کو پیش کرنے کیلئے اقبال نے جو زبان استعمال کی ہے وہ رنگین، تصوّراتی، اور غیر معیّن ہونے کے باعث منطقی بحث کے لیے تو مناسب نہیں ہے۔ البتہ احساسات اور جذبات کے لیے بہترین محرّک ثابت ہوئی ہے۔ نیز ان کے کلام سے یہ بات صاف طور پر عیاں ہے کہ وہ اپنے قارئین کو ایسا پیام دینا چاہتے ہیں

جس پر بار بار غور و فکر کر کے وہ کسی نتیجہ پر پہنچے ہیں — اور اس طرح ایک خشک منطقی گفتگو کی بجائے وہ زیادہ تر شاعرانہ رنگینی کے ذریعے ہمارے وجدان سے اپیل کرتے ہیں اور ہمیں اپنا ہمنوا بنا لیتے ہیں۔!!

اقبالؔ کا فلسفۂ خودی

دلت می لرزد از اندیشهٔ مرگ
ز بیمش زرد مانند زریری،
بخود بازآ خودی را پخته‌تر گیر
اگر گیری، پس از مردن نمیری

خودی ایک نور ہے، ایک شرر ہے جو ہمارے جسمِ خاکی میں ودیعت کیا گیا ہے۔ یہہ شرر عشق سے تقویت اور تابناکی حاصل کرتا ہے۔ اور یہی عشق اس کے جوہر کو نمایاں اور اُس کے ممکنات کو بیدار کر دیتا ہے۔

۱۔ پس منظر

۲۔ خودی کی ماہیت

۳۔ خودی کے مناصب

۴۔ خودی کا استحکام

(ا) عشق (ب) فقر (ج) شجاعت (د) رواداری

(ھ) کسبِ حلال (و) مقاصد آفرینی (ز) خوف

(ح) سوال (ط) غلامی (ی) تعصبات

۵۔ خودی کے مدارج

۶۔ مردِ کامل

۷۔ خودی اور موت

اقبالؔ کا فلسفۂ خودیؔ

پس منظر اقبال کا فلسفۂ خودی وقت کے چند اضطراری مسائل کا نتیجہ ہے۔ جب وہ سنِ شعور کو پہنچے تو اُنہوں نے دیکھا کہ مشرق کی قومیں سخت غفلت میں پڑی ہوئی ہیں۔ مغرب تمام مشرق پر چھا گیا ہے۔ ترکی حالتِ نزاع میں ہے۔ ایران حریف طاقتوں کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے۔ افغانستان اغیار کی سیاسی کشمکش میں مبتلا ہے۔ جنوب مشرقی ایشیار باہمی اختلافات سے تباہ اور سفید اقوام کی غلامی میں جکڑا ہوا ہے۔ اور چین متحارب جماعتوں کا میدانِ کارزار اور حریص اقوام کے فتنہ و فساد سے برباد ہو رہا ہے —— اقبال ان کمزوریوں کے اسباب و علل پر غور کرتے رہے اور بہت جلد اس نتیجہ پر پہنچے کہ مشرق کی اس المناک صورتِ حال کی ذمہ داری اُس فلسفیانہ نظام پر ہے جو کہ خودی کی نفی اور خود فراموشی کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ نظام اخلاقی صلاحیتوں کو مفلوج کر کے مشکلات سے فرار سکھاتا ہے اور انسان کو اس فریب میں مبتلا کر دیتا ہے کہ دشواریوں سے گریز کی جزا آخرت میں سکونِ قلب کی صورت میں نصیب ہوتی ہے —— ! یہ فلسفیانہ نظام جو زندگی کی جگہ موت کو اپنا نصب العین

قرار دیتا ہے دراصل افلاطونی اور ویدانتی افکار کا آئینہ دار ہے۔ افلاطون کے نزدیک انسانی جدوجہد کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُس کے ماننے والے اصلی زندگی اور حقائقِ فطرت کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ وہ وہم پرستی میں مبتلا ہوتے ہیں اور اُن کی تہذیب جامد اور غیر متحرک ہو کر غیر تخلیقی ہو جاتی ہے — اسی طرح ہندوستان میں جتنے بھی مذاہب معرضِ وجود میں آئے ہیں اُن میں دو چیزیں نمایاں ہیں۔ ایک تو "مکشا" کی تلاش اور دوسرے اس کے لئے ترکِ دُنیا، رہبانیت اور تپسیا کی تعلیم۔ برہمنیت اور بدھ مت کی طرح جین مت موت سے نہیں بلکہ زندگی سے فرار کی ہدایت کرتا ہے اور ایک ایسی کیفیت کی تلاش کی تعلیم دیتا ہے جہاں نہ تو نئے جنم کا کوئی تصور ہو، نہ باہمی تعلقات یا انسانی جذبات کا وجود ہو اور نہ کسی کشمکش یا حرکت کا کوئی امکان ہو۔ مسیحیت اور یہودیت نے بھی بہت جلد یہی طریقۂ فکر اختیار کیا۔ اور باوجود اس کے کہ اسلام نے انسانی عظمت، جدوجہد، کشمکش اور انقلاب پر اپنی تعلیمات کی بنیاد رکھی ہے، تھوڑے ہی عرصہ میں اسلامی مفکرین بھی یونانی طرزِ طرزِ تخیل سے متاثر ہو گئے اور خودی کی نفی اور خود فراموشی کے تصورات کی تبلیغ کرنے لگے۔ یہ تصورات، جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی دیکھا، ویدانتی افکار سے ماخوذ ہیں اور تصوف کے نظریۂ وحدت الوجود، یا ہمہ اوست میں معراجِ کمال کو پہنچتے ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق خدا محیطِ کل ہے اور دُنیا محض اُس کا ظہور ہے۔ ذاتِ باری حق اور خلق دونوں پر حاوی ہے۔ تمام عالم اصولِ وحدت کے تابع ہے۔ موضوع اور معروض کا فرق محض

نظر کا دھوکہ ہے۔ جو کچھ ہے وہ خدا کا ظہور ہے اور جو کچھ ہوتا ہے وہ اُسی کی مرضی کے تحت ہوتا ہے — اس طرح "ہمہ اوست" کے تصوّر نے اسلام کے بلند و برتر خدا اور انسانی عظمت کے قرآنی تصوّرات کی جگہ لے لی۔ اور مسلمانوں کا یہہ تصوّف عوام کو عمل اور انقلاب سے گریز کی تعلیم دینے لگا۔ نتیجتاً لوگوں کی قوّت سلب اور اُن کی صلاحیتیں زنگ آلود ہو گئیں۔ وہ میدانِ عمل سے نکل کر گوشہ ہائے تنہائی میں پہنچ گئے اور "نروانا" کے مسائل پر غور و فکر کو اپنا مقصدِ حیات سمجھنے لگے۔!

اسپین کے مشہور صوفی شیخ محی الدین العربی نے ہمہ اوست کے نظریہ پر دقیق بحث کی ہے اور اس کی تائید میں اپنی بیشتر توانائیاں صرف کر دی ہیں۔ اُن کے خیال کے مطابق خدا کے سوا کسی وجود کا تصوّر ہی غلط ہے، اور دُنیا غیر حقیقی، تصوّراتی اور معروضی طور پر غیر موجود ہے — "ہمہ اوست" کے اس عقیدہ پر متعدد اسلامی مفکرین بالخصوص ابنِ تیمیہّ اور شیخ احمد سرہندی نے حملے کئے ہیں۔ لیکن یہہ حملے صرف عقائد تک محدود رہے اور عملی زندگی کے تعلق سے اس عقیدہ کا کوئی انسداد نہ ہو سکا — بہر حال ایک طویل عرصہ تک فریقین ایک دوسرے کے خلاف لکھتے رہے، اعتراضات ہوتے رہے اور جوابات دیئے جاتے رہے، اور ساتھ ہی یہہ عقیدہ اسلامی نظام کو کھوکھلا کرتا رہا اور قوم کے ذہن و فکر کو مفلوج کر کے اغیار کی غلامی کی زنجیروں میں اُسے جکڑتا چلا گیا — یہاں تک کہ اقبال نے مرض کی تشخیص کی اور اعلان کیا کہ مشرق کی زبوں حالی اور بالخصوص مسلمانوں کی تباہی کا باعث

یہی عقیدۂ "ہمہ اوست" ہے جو کہ گھن کی طرح اقوام کی عملی صلاحیتوں کو کھاتا جا رہا ہے۔!

۱۹۰۵ء میں اقبال یورپ گئے۔ کیمبرج میں پروفیسر میکٹیگرٹ اور جمیس وارڈ کے زیرِ تعلیم رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد اُنہوں نے رومی کا مطالعہ شروع کیا اور ساتھ ہی جب نٹشے، فشٹے اور برگسان کے عقائد پہ گہری نظر ڈالی تو اُنہوں نے محسوس کیا کہ ان مغربی مفکرین کے چند بنیادی خیالات رومی کے تصورات سے بڑی حد تک ملتے جلتے ہیں۔ رومی کی طرح نٹشے ارتقاد، آزادی، خودی کی ترقی کے امکانات، ارادہ کی عظمت اور تعمیر کے لئے تخریب میں عقیدہ رکھتا ہے۔ اور برگساں حرکت کو حقیقت کا اور وجدان کو علم کا منبع قرار دینے میں رومی سے متفق ہے — اور اس طرح تاریخی واقعات اور اپنے وسیع مطالعہ کے پس منظر میں اقبال نے اپنے فلسفہ خودی کی بنیاد رکھی۔ کمزوروں کو حصولِ طاقت کی تدبیر سکھائی، غلام قوموں کو کشمکش و انقلاب کی تعلیم دی اور بھٹکے ہوئے راہیوں کو منزل کی راہ دکھادی۔!!

اقبال کے فلسفہ خودی پہ، جیسا کہ ہم نے ابھی دیکھا، رومی کے علاوہ مغرب کے تین مفکرین کے بھی اثرات پڑے ہیں۔ اس فلسفہ کی بنیاد پر فشٹے کا رنگ ہے۔ اس کے استحکام، کشمکش اور جہدِ مسلسل کا تصور نٹشے کے تصور سے ملتا جلتا ہے اور "زماں" اور "حیات" کے بارے میں برگساں کا تخیل نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ اقبال نے "اسرارِ خودی" میں برگساں کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس کے تمام فلسفہ کو امام شافعیؒ سے منسوب کیا ہے!

حالانکہ اُن کے اقوال میں کوئی فلسفہ موجود نہیں تھا اور نہ اُن کی سادگی ایسے فلسفہ کی متحمل ہو سکتی تھی۔

یہ صحیح ہے کہ فلسفۂ خودی کی تشکیل میں اقبال نے بہت سارے فلسفیوں اور عارفوں سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اُن کی اپنی انفرادیت باقی ہے۔ اُنہوں نے کسی کی محض تقلید نہیں کی ہے۔ وہ ہر بڑے متفکر کے ساتھ کچھ دور جاتے ہیں لیکن فوراً اپنے راستہ پر لوٹ آتے ہیں ——— مثلاً نٹشے کے وہ خیالات جو خودی کے استحکام، شخصیت کی تعمیر اور انسان کے عروج کے متعلق ہیں اقبال کو بہت پسند ہیں۔ لیکن اِن میں جو تخریبی عنصر ہے وہ اقبال کے مزاج کے کسی طرح مطابق نہیں ہے۔ نٹشے کے ہاں قوت کا تصور ایسا بیرحمانہ ہے کہ وہ تمام لطافتوں کو زائل کر کے زندگی کو محض میدانِ کارزار بنا دیتا ہے۔ لیکن اقبال کے ہاں "خودی" کے ساتھ ساتھ "بیخودی" بھی موجود ہے جو مختلف اقدارِ حیات میں اعتدال اور توازن قائم کر کے زندگی کی عظمت کو دوبالا کر دیتی ہے۔!

خودی کی ماہیت

ہمہ اوست، کے نظریہ کے مطابق کائنات کی رُوح میں انسان کا جذب ہو جانا ضروری ہے۔ یعنی انسانی نجات کے لئے خودی کی نفی لازمی ہے۔ لیکن اسلام کی ہدایت اِس کے برعکس ہے۔ قرآنی بصیرت کے لحاظ سے کائنات میں عملِ تخلیق جاری ہے اور خدا کے علاوہ دیگر خالقین کا امکان بھی موجود ہے۔

فتبارک اللہ احسن الخالقین

یعنی خدا سب سے بڑا خالق ہے اور انسان بھی اشرف المخلوقات ہونے

کی وجہ سے خدا کی تخلیقی صفت اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن یہ اُسی وقت ممکن ہے جبکہ خودی کی نفی کی بجائے خودی کا اثبات کیا جائے، اور انفرادیت و شخصیت کے استحکام کی بہتر سے بہتر صورت پیدا کی جائے۔ لہٰذا انسان کو چاہیئے کہ وہ زیادہ عدیم المثال بن جانے کی مسلسل جدوجہد جاری رکھے۔ جیسا کہ رسولِ عربی نے فرمایا ہے کہ:۔ تخلقوا باخلاق اللہ

یعنی اپنے اندر خدا کے اوصاف پیدا کرو جو کہ ایک نہایت عدیم المثال فرد ہے تاکہ تمہاری زندگی بھی عدیم المثال بن سکے — لیکن یہ زندگی کیا ہے؟ اقبال کہتے ہیں کہ یہہ ایک انفرادیت ہے۔ اس کی اعلیٰ ترین شکل خودی ہے جس میں فرد بجائے خود ایک مکمل اور سالم مرکز بن جاتا ہے۔ وہ خودی کے متعلق فرماتے ہیں کہ:۔

"یہ وحدتِ وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات وجذبات مستنیر ہوتے ہیں، یہہ پُر اسرار شئے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے۔ یہہ "خودی" یا "انا" یا "میں"، جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے، جو تمام مشاہدات کی خالق ہے، مگر جس کی لطافت مشاہدہ کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی، کیا چیز ہے؟ کیا یہ لازوال حقیقت ہے، یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنے فوری عملی اغراض کے حصول کے لیئے اپنے آپ کو اس فریبِ تخیل یا دروغ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے؟ اخلاقی اعتبار سے افراد و اقوام کا طرزِ عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے۔"

گویا اقبال کے نزدیک خودی ایک لازوال حقیقت ہے۔ وہ کائناتِ ہستی کے ہر ذرّہ میں نمایاں ہے۔ لیکن اِس کا انتہائی کمال انسان میں ظاہر ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کو یہی جذبہ حرکت میں لاتا ہے۔ اور نت نئے نصب العین کی تخلیق سے زندگی میں کشش اور اُس کی بقا کی صورت پیدا کرتا ہے۔ اِس کی بدولت ایک نصب العین کے حصول کے ساتھ ہی جدید نصب العین انسان کے سامنے آجاتا ہے اور اِس طرح کوششِ پیہم کا سلسلہ مستقل اور مستحکم ہوجاتا ہے۔!

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

خودی کی بدولت انسان خدائی کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ وہ خود خدا کے اندر جذب نہیں ہوتا۔ حیات ایک ترقی پذیر انجذابی حرکت ہے جس میں نہ صرف خدا کی صفات بلکہ انسان کی راہ کی تمام رکاوٹیں بھی جذب ہو جاتی ہیں۔ سب سے بڑی رکاوٹ عناصرِ فطرت کی طرف سے ہوتی ہے۔ لیکن انسانی خودی جب ان پر غلبہ حاصل کرنے کی جدوجہد شروع کر دیتی ہے تو آئینِ فطرت انسان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے اور اُس کو آگے بڑھانے میں مدد کرنے لگتے ہیں۔

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے بیداریِ کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند — سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے — نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
زمانہ کے دھارے میں بہتی ہوئی — ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی

تجسّس کی راہیں بدلتی ہوئی دمادم نگاہیں بدلتی ہوئی
ازل سے ہے یہہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

زورِ خودی کی بدولت رائی پہاڑ اور ضعفِ خودی سے پہاڑ رائی بن جاتا ہے۔ زندگی کا نظم و ضبط اور انسانی شخصیّت کی پائداری اس کے بغیر ممکن نہیں۔ اسرارِ خودی کے انکشاف سے پانی کا قطرہ گوہرِ تابدار ہو جاتا ہے۔ سبزہ گلشن کے سینے کو چاک کر کے باہر نکل آتا ہے اور زندگی کی جوئے نرم بحرِ ذخّار میں تبدیل ہو جاتی ہے ــــ!

چوں حیاتِ عالم از زورِ خودی است پس بقدرِ استواری زندگی است
قطرہ چوں حرفِ خودی از بر کند ہستئِ بے مایہ را گوہر کند
سبزہ چوں تابِ دمید از خویش یافت ہمتِ او سینۂ گلشن شگافت
چوں خودی آرد بہم نیروئے زلیست
می کشاید قلزمے از جوئے زلیست

خودی کی تقویت اور اثباتِ ذات سے سیرت میں چمک پیدا ہوتی ہے "اسرارِ خودی"، میں الماس اور کوئلہ کا جو مکالمہ درج ہے اُس سے اقبال اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتے ہیں کہ کشمکش اور پیچ و تاب سے شخصیت میں پختگی اور روشنی پیدا ہوتی ہے۔ اِس مکالمہ پر نطشے کا اثر غالب ہے ــــ کیمیاوی اعتبار سے الماس اور کوئلہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن مرورِ زمانہ سے الماس سختی اختیار کرتا ہے جو اُس کو حُسن و جمال اور آب و تاب بخشتی ہے۔

لیکن کوئلہ اپنی نرمی کے باعث بدصورت اور ذلیل و خوار رہتا ہے۔ اسی طرح سنگِ اسود کی حقیقت کیا ہے؟ اگر وہ حرم کے باہر ہوتا تو اُس کی اہمیت مشتِ خاک سے زیادہ نہیں ہوتی۔ لیکن آج وہ تمام دنیا کا بوسہ گاہ بنا ہوا ہے اور اس کا مقام طور سے بھی بلند ہو گیا۔ یہی حال انسان کا بھی ہے۔ اُس کی رفعت سخت گیری میں پنہاں ہے اور شخصیت کا راز سخت کوشی میں مضمر ہے۔!

می شود از وے دو عالم مستنیر　　ہر کہ باشد سخت کوش و سخت گیر
مشتِ خاکِ اصلِ سنگِ اسود است　　کو سر از جیبِ حرم بیروں نوست
رتبہ اش از طور بالاتر شد است　　بوسہ گاہِ اسود و احمر شد است

در صلابت آبروئے زندگی است
ناتوانی ناکسی ناپختگی است

اثباتِ ذات سے بقا کی ضمانت اور خودی کے استحکام سے شخصیت کی حفاظت ہوتی ہے۔ "اسرارِ خودی" میں شبنم اور الماس کی حکایت اسی حقیقت پر دلالت کرتی ہے۔ ایک پیاسا پرندہ الماس کو پانی کا قطرہ سمجھ کر اُس پر چونچ مارتا ہے۔ لیکن نامراد رہتا ہے۔ اس کے بعد شاخِ گل پر نظر ڈالتا ہے تو اُسے قطرۂ شبنم نظر آتا ہے جو آسانی سے اُس کے حلق کے نیچے اُتر جاتا ہے ——!

اے کہ می خواہی ز دشمن جاں بری　　از تو پرسم قطرۂ یا گوہری؟
چوں ز سوزِ تشنگی طائر گداخت　　از حیاتِ دیگرے سرمایہ ساخت
قطرہ سخت اندام و گوہر خو نبود　　ریزۂ الماس بود و او نبود

غافل از حفظِ خودی یک دم مشو
ریزۂ الماس شو شبنم مشو

نٹشے کی طرح اقبال کے خیال میں تخلیق کا منبع اور ماخذ "وجودِ باسط" ہے جسے مکمل قوّتِ ارادی اور قوّتِ ادراک حاصل ہے۔ اِن قوتوں کو معرضِ عمل میں لانے کے لیۓ وجودِ باسط غیر ذات (un self) کی تخلیق کرتا ہے جس کا مقصد خود کو دیکھنے کے لیۓ ایک آئینہ کی تشکیل اور حرکت یا بالیدگی کے لئے ایک مقصد کی فراہمی ہوتا ہے۔ یہ خودی مطلق "فعال ہے"، ہے جس کی جدوجہد مسلسل جاری رہتی ہے۔ اسرارِ خودی کے بارھویں صفحہ پر جو فلسفۂ خودی بیان کیا گیا ہے اُس پر نٹشے کا ہی رنگ غالب ہے۔ اقبال نے اُس کے نظریہ کو قبول کر کے نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ :-

پیکرِ ہستی ز آثار خودی است
هر چه می بینی ز اسرارِ خودی است

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد
آشکارا عالمِ پندار کرد

صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او
غیرِ او پیداست از اثباتِ او

در جہاں تخمِ خصومت کاشت است
خویشتن را غیرِ خود پنداشت است

سازد از خود پیکرِ اغیار را
تا فزاید لذّتِ پیکار را

میکشد از قوّتِ بازوے خویش
تا شود آگاہ از نیروے خویش

مناصب | انسانی خودی کے تین مناصب ہوتے ہیں۔ ایک تو ماحول سے

کشمکش کرنا، دوسرے مستقل تناؤ کی حالت کو برقرار رکھنا، اور تیسرے مردِ کامل کی تخلیق کے لئے جد و جہد کو جاری رکھنا — ماحول سے کشمکش کر کے خودی اُس پر فتح حاصل کر سکتی ہے اور اُس کی زنجیروں کو کاٹ کر آزاد ہو سکتی ہے۔ اِس کے بعد وہ آسانی سے خدا تک پہنچ سکتی ہے جو کہ آزاد ترین فرد ہے نیز اُسے اپنے مستقل تناؤ (tension) کو برقرار رکھنا پڑتا ہے تاکہ حیات جاودانی حاصل کر کے زمان و مکان کی قیود سے وہ بالاتر ہو سکے۔ ساتھ ہی انسانیت کی ترقی اور مردِ کامل کی تخلیق کے لئے بھی اُسے مسلسل کاوشش کرنی پڑتی ہے کیونکہ تمام حیات مردِ کامل کی منتظر اور اُسی کے لئے آرزومند رہتی ہے —!!

استحکام

لیکن ان تینوں مناصب کی انجام دہی خودی اور شخصیت کے استحکام کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ جس کے لئے حسبِ ذیل امور ناگزیر ہیں۔

۱۔ عشق ۲۔ فقر ۳۔ شجاعت ۴۔ رواداری ۵۔ کسبِ حلال ۶۔ مقاصد آفرینی۔

عشق

جہاں تک کہ فرد کا تعلق ہے، محبوب کی نمایاں خصوصیات کو اپنے اندر جذب کرنے کا دوسرا نام عشق ہے۔ یہ عمل انجذاب مسرت کی تخلیق کرتا ہے اور جذبۂ عشق کے تناؤ کو برقرار رکھتا ہے — لیکن اقبال نے عشق کی اصطلاح کو بہت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے اُن کے نزدیک عشق محض ذاتی مسرت کا سبب ہی نہیں بلکہ زندگی کا اہم ترین محرک بھی ہے۔ کائنات کو وہ حیاتِ نو دیتا ہے، تمام انسانی بُرائیوں کا ردِّ عمل فراہم

کرتا ہے اور حسین تخیلات کی پرورش کر کے اقدارِ حیات میں لطافت پیدا کرتا ہے "اسرارِ خودی" میں خودی اور عشق کے باہمی تعلق کو اقبال نہایت وضاحت سے پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں خودی ایک نور ہے۔ وہ ایک شرر ہے جو ہمارے جسمِ خاکی میں ودیعت کیا گیا ہے۔ یہ شرر عشق سے تقویت اور تابنا کی حاصل کرتا ہے۔ اور یہی عشق اُس کے جوہر کو نمایاں اور اُس کے ممکنات کو بیدار کر دیتا ہے ــــ!

نقطۂ نورے کہ نامِ او خودی است　　زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است

از محبّت می شود پائندہ تر　　زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر

از محبّت اشتعالِ جوہرش

ارتقائے ممکناتِ مضمرش

عشق ہی کے باعث خودی میں سوز پیدا ہوتا ہے جس سے وہ کائنات کو منوّر کر سکتی ہے۔ اور اِسی کی بدولت مٹھی بھر خاک سے کیمیا بنائی جا سکتی ہے ــــ!

فطرتِ او آتش اندوزد ز عشق　　عالم افروزی بیاموزد ز عشق

کیمیا پیدا کن از مشتِ گِلے　　بوسہ زن بر آستانِ کاملے

محبوب کے عادات و اطوار کی تقلید عشق ہی کی ایک صورت ہے، کیونکہ اِس طرح عاشق اپنے محبوب کی خصوصیات کو اپنے اندر جذب کر کے اُس سے قریب تر ہو جاتا ہے۔ اور ایک برتر فرد سے یہ قرب اُس کی شخصیت کی پختگی میں ممد و معاون ہو جاتا ہے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ کو آنحضرت صلعم سے گہری محبّت تھی۔ وہ ہر کام سرکارِ مدینہ کے طریقہ پر انجام دیتے تھے اور ہر معاملہ میں آپ ہی کے نقشِ قدم پر چلتے تھے۔ اُنہوں نے خربوزہ کھانے سے محض اس لئے اجتناب کیا تھا کہ انہیں معلوم نہ ہو سکا تھا کہ سرورِ کائنات اِس پھل کو کس طرح کھایا کرتے تھے۔ اُن کے اِس عشقِ کامل ہی کی بدولت اُنہیں مقاماتِ بلند حاصل ہوئے اور حیاتِ جاوید نصیب ہوئی۔ اقبال اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عاشق کو تقلیدِ یار سے جب تقویت حاصل ہوتی ہے تو ساری خدائی اُس کی زد میں آجاتی ہے ——!

کیفیت ہا خیزد از صہبائے عشق　　　ہست ہم تقلید از اسمائے عشق

کاملِ بسطام در تقلید فرد　　　اجتناب از خوردنِ خربوزہ کرد

عاشقی؟ محکم شو از تقلیدِ یار
تا کمندِ تو شود یزداں شکار

خدا نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے —— وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً۔ یعنی اے انسان یاد کر اُس وقت کو جبکہ تیرے خدا نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں —— لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسا انسان ہے جو اس مقدس فرض کو کماحقہٗ انجام دے سکتا ہے؟ اقبال کہتے ہیں کہ صرف وہی انسان جسکی خودی عشق کی بدولت طاقتور ہوگئی ہو، خدا کی زمین پر حکومت کا اہل اور خدا کا نائب کہلائے جانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔

لشکرے پیدا کن از سلطانِ عشق　　جلوہ گر شو بر سرِ فارانِ عشق
تا خدائے کعبہ بنوازد ترا،　　شرحِ اِنّی جاعِلؑ سازد ترا

ہر زبان کی شاعری محبّت کی رنگینیوں سے معمور ہے۔ ہر قوم کے صوفیوں نے عشق کو مقدس مقام دیا ہے۔ اور ہر مذہب کے ہادیوں نے انسانی برائیوں کے ازالہ کے لئے اُسے ضروری قرار دیا ہے۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی اقبال کی طرح شخصیّت کے ارتقا اور خودی کے استحکام کے تعلق سے محبّت کے اس پہلو پر زور نہیں دیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ خودی جب عشق سے لیس ہوتی ہے تو انسانی قدریں بدل جاتی ہیں اور عناصرِ فطرت کو مُسخّر کرکے انسان سارے عالم کا حکمران ہو جاتا ہے۔ شق القمر کا معجزہ سرکارِؐ دو عالم کے عشق ہی کی بے پناہ طاقت کا نتیجہ تھا اور خیبر کی فتح حضرت علیؓ کی طاقتور شخصیّت کی رہینِ منّت تھی جو عشق کی بدولت زندہ و تابندہ ہو گئی تھی ——!

عشق بانانِ جویں خیبر کشاد　　عشق در اندامِ مہ چاکے نہاد!
چوں خودی را از خدا طالب شود　　جملہ عالم مرکب او راکب شود

فقر اصطلاحِ عام میں فقر سے بھیک مانگنا اور فقیر سے بھکاری مراد ہوتا ہے۔ لیکن اقبال کے نزدیک فقر کے معنی مادی وسائل سے بے نیازی اور دینی یا دنیوی انعام اور بدل کے تصوّر سے نفرت ہے۔ فقر ذہن کی ایسی کیفیت ہے جس کے تحت انسان کسی اعلیٰ مقصد کے لئے جدوجہد تو کرتا ہے لیکن اس کے معاوضہ کا آرزومند نہیں ہوتا۔ یہ صورتِ حال اُسے ہر لالچ سے محفوظ رکھتی ہے، اُس پر اسرارِ جہانگیری کو فاش کرتی ہے اور اُس کے ذہن و فکر کو خاصیتِ اکسیر

عطا کر دیتی ہے۔!

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری — اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری — اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری

راہب کی طرح فقیر سکون کا خواہشمند نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ انقلاب چاہتا ہے۔ آندھیوں میں اُسے لطف آتا ہے اور طوفانی موجوں سے وہ کھیلتا رہتا ہے تاکہ روح و بدن کی بالیدگی کا سلسلہ جاری رہے اور اُس کی خودی آزاد ہو کر ظاہر ہو جائے۔۔! مسلمانوں نے جب سے فقر کی اس دولت کو کھو دیا ہے اُس وقت سے وہ اپنی عظمت اور دنیوی اقتدار سے بھی محروم ہو گئے ہیں۔

سکوں پرستیِ راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی

پسند روح و بدن کی ہے وانمود اِس کو
کہ ہے نہایتِ مومن خودی کی عریانی

یہ فقرِ مردِ مسلماں نے کھو دیا جب سے
رہی نہ دولتِ سلمانی و سلیمانی!

فقر سے انسانی بصیرت میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اِس کی گرمی سے امارت کا رعب برف کی طرح پگھل جاتا ہے۔ اور بادشاہت کا جلال اس کی آگ میں خس و خاشاک کی مانند جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔۔!

مردِ فقیر آتش است، میری و قیصری خس است،
فال و فرِ ملوک را، حرفِ برہنہ بس است

بادشاہت سحرِ سامری ہے۔ یہہ جنگ اور خونریزی سے فتوحات حاصل کرتی ہے اور جبر و قہر کے ذریعے اپنی بقا کا سامان مہیا کرتی ہے۔ لیکن قلندری اپنے جوہر کے لحاظ سے صلح و آشتی ہے۔ یہ پیامِ محبت ہے جو خودی کے دوام کی ضامن ہے، یہہ جذبۂ کلیم ہے جس کی ایک نگاہ کائنات میں زلزلہ ڈالدیتی ہے، جس کی ایک ضرب سدِ سکندری کو توڑ دیتی ہے ——!

دبدبۂ قلندری طنطنۂ سکندری — آں ہمہ جذبۂ کلیم، ایں ہمہ سحرِ سامری،
آں بہ نگاہ می کشد، ایں بہ سپاہ می کشد — آں ہمہ صلح و آشتی، ایں ہمہ جنگ و داوری
ہر دو جہاں کشا ستند ہر دو دوام خواستند — ایں بہ دلیلِ قاہری، آں بہ دلیلِ دلبری

ضربِ قلندری بیار سدِّ سکندری شکن
رسمِ کلیم تازہ کن رونقِ ساحری شکن!

شجاعت

دنیا ایک میدانِ کارزار ہے جہاں جسمانی اور اخلاقی شجاعت کے بغیر کامیابی کا تصور ممکن نہیں ہے۔

یہہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

بزدلی سے زندگی کا جوہر اپنی تابناکی کھو دیتا ہے اور آرام پسندی سے شخصیت کمزور پڑجاتی ہے۔ اصلی زندگی کشمکش میں مضمر ہے۔ شخصیت کی بلندی شجاعت اور جرأت میں پوشیدہ ہے۔ کوئی مہم دلیری کے بغیر طے نہیں ہوسکتی، کوئی مشکل جانبازی کے بغیر حل نہیں ہوسکتی اور رات کی تاریکی دور نہیں ہوسکتی۔ اگر آسمان کے ستاروں سے اُن کی شجاعت چھین لی جائے۔ یہ جانباز ستارے رات بھر کشمکش کرتے

رہتے ہیں تب جاکر ہم دیکھتے ہیں۔

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!

شجاعت صرف مادّی خطرات کے مقابلہ ہی کا نام نہیں ہے بلکہ صبر آزما حالات میں اپنے نصب العین اور اقدار کو برقرار رکھنا بھی شجاعت ہی کی ایک اعلیٰ شکل ہے۔ جس شخص کی خودی طاقتور ہوتی ہے وہ زمانہ سازی سے نفرت کرتا ہے، دروغ مصلحت آمیز کو روباہی سمجھتا ہے اور دار ورسن پر بھی حق گوئی و بیباکی سے گریز نہیں کرتا — !

آئینِ جوانمرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

رواداری

طاقت اور شجاعت کا ایک نتیجہ رواداری ہے۔ وہی شخص غیر کے نقطۂ نظر اور طرزِ عمل کو برداشت کر سکتا ہے جس کی نظر وسیع اور اخلاقی حالت صحتمند ہو۔ معاشرہ کی نشوونما کے لئے رواداری کا جذبہ نہایت ضروری ہے کیونکہ افراد کی صلاحیتوں سے معاشرہ مستفید ہوتا ہے اور کسی فرد کی صلاحیتیں اُجاگر نہیں ہو سکتیں اگر اُس کے لئے ماحول حوصلہ فرسا اور فضا ہمت شکن ہو — اس لئے خودی کو جذبۂ رواداری کی پرورش کرنی چاہیئے جو کہ بالآخر خودی ہی کے استحکام کا سبب بن جاتا ہے۔

اس سے قطع نظر انسانیت کا تقاضہ یہہ ہے کہ دوسرے انسان کا احترام کیا جائے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے، اپنی تعظیم و تکریم کا مستحق ہے اور اس کے متعلق کسی بُرے لفظ کا استعمال سخت گناہ ہے۔ انسانیت کے

نقطۂ نظر سے کافر و مومن میں کوئی فرق نہیں ہے اور اسی وجہ سے وہ شخص جس کی خودی بلند ہوتی ہے خدا کے طریق پہ گامزن ہو کر کافر و مومن پر یکساں شفیق ہو جاتا ہے۔

حرفِ بد را بر لب آوردن خطاست | کافر و مومن ہمہ خلق خدا است!
آدمیت احترامِ آدمی ، | باخبر شو از مقامِ آدمی!
آدمی از ربط و ضبطِ تن بہ تن | بر طریقِ دوستی گامے بزن!

بندۂ عشق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق!

کسبِ حلال

کسبِ حلال کا تصوّر ہر شعبۂ زندگی میں مخلصانہ کشمکش کیلئے وجہ تحریک فراہم کرتا ہے۔ فریب، دھوکہ یا سرقہ کے ذریعے کسی شئے کا اکتساب نہ صرف قلب کو سیاہ اور ضمیر کو گندہ کرتا ہے بلکہ وہ کشمکش و جدوجہد کی تمام صلاحیتوں کو بھی ناکارہ اور معدوم کر کے انسان کو نکمّا اور اپاہج کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس کسبِ حلال کی خواہش خودی کو محنت کی طرف مائل کر کے کشمکشِ حیات کے لئے تیار کرتی ہے اور قناعت و رہبانیت کے تخیّل کو زائل کر دیتی ہے۔ بغیر مشقت کے کسی چیز کا حصول انسانی توانائیوں کے لئے انتہائی مضر اور خودی کے حق میں زہرِ ہلاہل سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ ہیرے و جواہر کسی شخص کو اُس کے باپ کے ترکہ میں مل جائیں تو اُس کے لئے خوشی کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ پہاڑ کو کاٹ کر پتھر سے ہیرا برآمد کرنے میں جو لطف

آتا ہے وہ بغیر کاوش کے اُس کو حاصل کرنے میں کبھی میسّر نہیں ہو سکتا۔!

پشیماں شو اگر لعلے ز میراثِ پدر خواہی،
کجا عیشِ برون آوردنِ لعلے کہ در سنگ است

اقبال کہتے ہیں کہ رزقِ حرام سے خودی کمزور ہو جاتی ہے اور انسان کے ذہن و فکر کی پرواز میں کوتاہی آجاتی ہے۔ اِس لئے ایسے رزق سے اجتناب کرنا چاہیئے خواہ اس کے باعث فاقہ کشی ہی کی نوبت کیوں نہ آئے۔!

اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

مقاصد آفرینی

کسبِ حلال کی تعلیم سے جدوجہد کی آرزو پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اس جدوجہد کی غرض اصلی اور انوکھے مقاصد کی تخلیق ہونی چاہیئے۔ کیونکہ زندگی کی بقا مقاصد آفرینی میں مضمر ہے اور اُس کی کامیابی جستجو ہی میں پوشیدہ ہے —!

زندگانی را بقا از مدعاست — کاروانش را درا از مدعاست
زندگی در جستجو پوشیدہ است — اصلِ او در آرزو پوشیدہ است
ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم — از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

مقاصد کے حصول کے لئے آرزو کی تخلیق انسانی خودی کے ارتقا کی بہترین ضمانت ہے، کیونکہ آرزو ہنگامے بپا کرتی اور خودی کے سمندر میں تلاطم پیدا کرتی ہے۔

آرزو ہنگامہ آرائے خودی — موجِ بیتابے ز دریائے خودی

آرزو ہی کے سبب سے اس دُنیا میں رونق ہے۔ یہہ ہر شئے کی فطرت میں داخل ہے۔ اسی کی بدولت دِل سینے میں رقص کرتا ہے اور اسی کی روشنی سے سینہ آئینہ کی طرح چمکدار ہو جاتا ہے ــــ!

آرزو جانِ جہانِ رنگ و بوست　　فطرتِ ہر شئے امینِ آرزوست
از تمنّا رقصِ دل در سینہ ہا　　سینہ ہا از تابِ او آئینہ ہا

اقبال تعمیر و تخلیق پر بہت زور دیتے ہیں کیونکہ اُن کے نزدیک اِسی پر کائنات ہستی کا انحصار ہے۔ ذوقِ تخلیق سے انسان تمام عالم پر غلبہ اور حیاتِ سرمد حاصل کر سکتا ہے۔ مومن و کافر کا فرق یہی ہے کہ کافر ذوقِ تخلیق سے محروم ہوتا ہے اور مومن سب سے بڑے خالق یعنی احسن الخالقین کی تخلیقی صفت حاصل کر لیتا ہے ــــ!

زندگی ہم فانی و ہم باقی است　　این ہمہ خلاقی و مشتاقی است
زندہ مشتاق شو، خلّاق شو　　ہمچو ما گیرندہ آفاق شو

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست
پیش ما جز کافر و زندیق نیست

حسبِ ذیل عناصر خودی کو کمزور کر دیتے ہیں:۔

۱۔ خوف　۲۔ سوال۔　۳۔ غلامی۔　۴۔ تعصبات

خوف انسانی مسائل میں خوف مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ فکرِ انسان اس مسئلہ سے بالعموم مرعوب ہو کر شکست کھاتی رہی ہے اور اگر کبھی اس پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی بھی ہے تو اپنی ہی بھول بھلیوں اور کوتاہ بینی کے

جال میں اُلجھ کر رہ گئی ہے ــــ ارسطو غالباً پہلا مفکر تھا جس نے انسان کو انسانی خوف سے نجات دلانے کی تجویز پر غور کیا۔ اور اُس کے بعد موجودہ مجلسِ اقوام متحدہ کے قیام تک غیر اسلامی اصولوں پر متعدد کوششیں اِس بارے میں ہوتی رہیں۔ لیکن مسئلہ کے حل کی دریافت تو کجا اُس کی شدت میں ہر نوبت پر اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔ لیگ آف نیشنز دوسری جنگِ عظیم کو جنم دے کر خود فنا کے گھاٹ اُتر گئی۔ اور آج مجلسِ اقوام متحدہ نے نوعِ انسانی کو ایک وحشتناک جوہری جنگ کے دروازہ پر لا کھڑا کیا ہے۔ مادہ اندر ہی اندر پکتا جا رہا ہے۔ اور اس مقام اور اُس وقت کا تعین مشکل معلوم ہوتا ہے جبکہ یہہ کوہِ آتش فشاں پھوٹ پڑے گا اور اپنے جلتے ہوئے لاوے کے سیلاب میں انسانی تہذیب و تمدّن کی ساری متاع کو بہا لے جائے گا ــــ!

آج ہمیں زندگی کی ایک بحرانی کیفیت نظر آتی ہے۔ خوف و ہراس اور ناکامی و نامرادی کے گھناؤنے سائے انسانی شعور کے طول و عرض پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک طرف طبقاتی استحصال جاری ہے تو دوسری طرف بین الاقوامی کشیدگی کی ہیبت انسان کے سر پر مسلط ہے ــــ اور خود اپنے ہی ہاتھوں لائی ہوئی مصیبتوں اور اپنے ہی ذہن کی پیدا کردہ ڈراؤنی شکلوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے، جوگ اور رہبانیت، آواگون اور تناسخ کے تصوّرات انسان کے ذہن کو گھن کی طرح کھا رہے ہیں۔ اور دیگر مخلوقاتِ الٰہی کا خوف اُس کے تمام فکری اور عملی قویٰ کو مفلوج کیے ہوئے ہیں ــــ خوف کی اِن تمام صورتوں کا علاج اسلام نے بہت پہلے پیش کیا ہے۔ محمد عربی نے بین الاقوامی خوف کے انسداد کے لیے فرمایا کہ:۔

لیس للعربی فضل علی العجمی ولا العجمی فضل علی العربی کلکم ابناء آدم وآدم من تراب :-

یعنی عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر کوئی فضیلت نہیں ہے اور تم سب آدم کے بیٹے ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے ---!

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند ۔۔۔ کہ در آفرینش ز یک جوہر اند!

اسی طرح بے جا خونریزی کو قرآن نے یہہ کہکر مسدود کر دیا کہ :-

ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ

یعنی مت مارو کسی کی جان کو جو اللہ نے منع کر دی ہے۔ نیز دیگر مخلوقاتِ الٰہی کے خوف کا سدِ باب اس حقیقت کے انکشاف سے کر دیا کہ انسان کو خدا نے زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کر کے ہر شئے پر اُسے حکومت عطا کر دی ہے۔!

الم تر ان اللہ سخر لکم ما فی الارض

خوف انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ یہہ انسانی کارکردگی اور مسرتوں کو تباہ کرتا ہے اور انسان کے احساسات و جذبات میں بے راہ روی پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے --- لیکن بدقسمتی سے ہمارے مفلوج معاشرہ میں اس کی جڑیں بہت مضبوط ہو گئی ہیں۔ ماں کی گود میں، گھر، مدرسہ اور سماج میں انسان کی تربیت خوف ہی کے ذریعے کی جاتی ہے۔ گویا مہد سے لحد تک اُسے خوف ہی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نتیجتاً اُس کی صلاحیتیں تباہ ہو جاتی ہیں، اُس کی قوت ارادی مضمحل اور شخصیت کمزور ہو جاتی ہے۔ اسی سبب سے قرآن نے انسان کی ہمت افزائی کی ہے اور غیر اللہ کے خوف کو دل سے نکال دینے کی بار بار تاکید فرمائی ہے

الا ان اولیاء اللہ لا خوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون

یعنی اللہ کے دوست کسی بات سے نہ ڈرتے ہیں اور نہ مایوس ہوتے ہیں۔

اقبال بھی اسی حقیقت کے مدّنظر کہتے ہیں کہ نبی کریم کی تعلیم ہمیں رنج وغم سے نجات دلا سکتی ہے اور خُدا کی ذات پر بھروسہ کرنے سے تمام خوف وہراس کا ازالہ ممکن ہے ـــ!

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر　　از نبیؐ تعلیمِ لاتحزنَ بگیر
گر خدا داری ز غم آزاد شو　　از خیالِ بیش و کم آزاد شو
قوتِ ایماں حیات افزایدت　　وردِ لاخوفٌ علیھم بایدت
چوں کلیمے سوئے فرعونے رود
قلبِ او از لاتخَف محکم شود

وہ کہتے ہیں کہ غیر اللہ کا خوف انسانی عمل کا بہت بڑا دشمن اور کاروانِ حیات کا رہزن ہے۔ رسولِ عربیؐ کی تعلیم کی بنیاد ہی لاخوفٌ علیھم ہے۔ اور جو شخص اس راز سے باخبر ہے وہ جانتا ہے کہ خوف ہمیشہ شرک وکفر میں مضمر رہتا ہے:

بیمِ غیر اللہ عمل را دشمن است　　کاروانِ زندگی را رہزن است
ہر کہ رمزِ مصطفےٰ فہمیدہ است　　شرک را در خوف مضمر دیدہ است

سوال کسی چیز کے لئے غیر کی محتاجی انسانی خودی کو کمزور کر دیتی ہے۔ یہ محتاجی، خواہ کسی گداگر کی مجبوری کی صورت میں ہو یا کسی شہنشاہ کے جبر واستحصال کی شکل میں، ہمیشہ شخصیت کو تباہ اور حوصلوں کو پست کرنے کا سبب ہوتی ہے۔ بھکاری اور شہنشاہ دونوں غیر کے محتاج ہوتے ہیں

اس لیئے دونوں کی خودی مفلوج اور مجروح رہتی ہے۔

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

سوال حالتِ افلاس کو نہایت بھیانک رنگ میں پیش کرتا ہے اور گداگر کے دل میں شدید احساسِ پستی پیدا کر کے زندگی کے کیف کو زائل کر دیتا ہے۔ اور یہہ المناک کیفیت نہ صرف اجزائے خودی کو پراگندہ کرتی ہے بلکہ اُس کی تابناکی بھی چھین لیتی ہے۔!

از سوال افلاس گردد خوار تر　　از گدائی گدیہ گر نادار تر
از سوال آشفتہ اجزائے خودی　　بے تجلّی نخلِ سینائے خودی

حضرتِ عمرؓ کا تازیانہ جب ہاتھ سے گر گیا تو اُسے زمین پر سے اُٹھا لینے کے لیئے آپ خود اونٹ سے نیچے اُتر آئے اور اِس معمولی کام کے لیئے بھی کسی کا احسان گوارا نہ فرمایا۔ اِس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؔ کہتے ہیں کہ خودی کی عظمت کے تحفظ کے لیئے غیر کی منّت سے پرہیز کرنا چاہیئے۔!

خود فرد آ از شتر مثلِ عمرؓ
الحذر از منتِ غیر الحذر

غیر کے احسان سے شخصیت کمزور اور ضمیر داغدار ہو جاتا ہے۔ چاند کے دل پر اس لیئے داغ پڑ گئے ہیں کہ وہ سورج کی نظرِ کرم کا محتاج ہے۔!

ماہ را روزی رسد از خوانِ مہر،
داغ بر دل دارد از احسانِ مہر

پروانہ آتشِ غیر کا محتاج ہوتا ہے، اس لیے اس کا وجود غیر کی نذر ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس جگنو کی خودی اُس کی شخصیت کی ضامن ہے کیونکہ وہ روشنی کے لئے کسی اور کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتا ـــ "بالِ جبریل" میں پروانہ اور جگنو کا مکالمہ نہایت دلچسپ انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ پروانہ جگنو سے کہتا ہے:۔

پروانہ کی منزل سے بہت دور ہے جگنو
کیوں آتشِ بے سوز پہ مغرور ہے جگنو

اس پر جگنو جواب دیتا ہے:۔

اللہ کا سو شکر کہ پروانہ نہیں میں
دریوزہ گرِ آتشِ بیگانہ نہیں میں

غلامی عصرِ حاضر میں انفرادی غلامی کا وجود نہیں ہے۔ لیکن اجتماعی اور قومی غلامی ایشیا اور افریقیہ کے اکثر حصوں میں موجود ہے۔ سفید قوموں کا قبضہ، تصرف کہیں بالراست ہے تو کہیں سیاسی بالادستی کی آڑ میں وہ کمزور قوموں پر مسلط ہو گئی ہیں اور جونک کی طرح اُن کا خون چوس رہی ہیں ـــ سیاسی اور معاشی استحصال کی یہ صورتیں غلامی ہی کی تعریف میں داخل ہیں۔ اور ان کی وجہ سے فضا اس قدر زہر آلود ہو گئی ہے کہ اس میں انسانیت کی ترقی ناممکن اور خودی کی بالیدگی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ درحقیقت انسانی نقشہ طرازیوں نے استحصال کی جتنی صورتیں پیدا کی ہیں ان سب میں زیادہ دردناک اور زیادہ توہین آمیز غلامی کا ادارہ ہے جو نہ صرف حیاسوز ہے بلکہ افراد اور

اقوام کے کردار کو تباہ کر کے اُن کے ضمیر کو تاریک اور روح کو مردہ کر دیتا ہے!

از غلامی دل بمیرد در بدن | از غلامی روح گردد بارِ تن
از غلامی بزمِ ملت فرد فرد | ایں و آں با ایں و آں اندر نبرد

اس لئے انفرادی اور اجتماعی غلامی سے نجات کی صرف یہی صورت ہے کہ خودی کو بیدار کیا جائے، خونِ جگر پر اُس کی پرورش کی جائے اور دل و دماغ پر اُسے پروان چڑھایا جائے ——!

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذّتِ نمود میں ہے!

تعصّبات

ابتداءً جبکہ خاندانوں کو سیاسی اقتدار حاصل تھا، لوگ ذی اقتدار خاندانوں سے اپنے تعلق کو باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ اِس کے بعد یہ اقتدار مملکت کو حاصل ہوا اور بالآخر انقلاب انگیز ہنگموں اور بالشویت کے اصولوں نے "نسل" کے ساتھ اِس اقتدار کو وابستہ کر دیا —— اب نسلی برتری کا ایک حیاتیاتی اصول مدوّن کیا گیا ہے جس کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ مخصوص نسلیں دنیا کی تمام نسلوں پر فوقیت رکھتی ہیں اور یہی نسلیں قوّت و حکومت کی اہل اور مستحق ہیں! —— لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے تعصّبات جن کی بنیاد غرورِ نسب یا جغرافیائی حدود پر ہو یا رنگ و نسل کے امتیاز پر جن کی اساس رکھی گئی ہو، انسانیت کی ترقی میں حائل اور ہمیشہ نوعِ انسانی کے انتشار کا باعث ہوتے ہیں۔ آسمان ان کی تباہ کاریوں کا شاہد ہے، تاریخ ان کی ہلاکت آفرینیوں سے پٹی پڑی ہے، اور سطحِ ارض کا چپہ چپہ ان کی خون آشامیوں سے

نگین ہے! اس لئے انسانیت کے عروج کی خاطر ان تعصبات کی بیخ کنی ضروری ہے اور انسانی خودی ان کے مکمل استیصال کی متقاضی ہے —! ان تعصبات کی بجائے جو مصنوعی اور تخریبی اقدار سے وابستہ ہیں، ملت کی اساس وسیع تر بنیادوں پر رکھنے کی ضرورت ہے۔ نوع انسانی کی فلاح وبہبود انسانی عظمت کے تصور اور اخوت ومحبت کے اُن بیش بہا عناصر میں مضمر ہے جن کا تعلق ذات وپات، قبیلہ وقوم اور رنگ ونسل کے امتیازات سے نہیں بلکہ ایک زندہ وبیدار دل اور اس کے سوز وساز سے ہوتا ہے —!

باوطن وابستہ تقدیرِ امم | برنسب بنیادِ تعمیرِ امم
اصلِ ملت در وطن دیدن کہ چہ | باد وآب وگِل پرستیدن کہ چہ
برنسب نازاں شدن نادانی است | حکمِ او اندر تن وتن فانی است

ملتِ مارا اساسِ دیگر است
ایں اساس اندر دِلِ ما مضمر است

مدارج اس طرح چند تعمیری قوتوں کی پرورش اور چند تخریبی عناصر کی شکست سے خودی ترقی کرتی جاتی ہے اور مندرجہ ذیل تین منازل سے گزرتی ہے۔

۱۔ اطاعت ۲۔ ضبطِ نفس ۳۔ نیابت الٰہی۔

اطاعت اقبال نے اطاعت کے لئے اونٹ کی تشبیہہ استعمال کی ہے۔ یہ تشبیہہ راست نٹشے سے لیگئی ہے۔ لیکن باقی دوسری منزلوں کا تصور اسلامی اَدب سے ماخوذ ہے۔ نٹشے بھی تین منزلوں کا ذکر کرتا ہے

جس سے رُوح کو گزرنا پڑتا ہے۔ اُس کے نزدیک پہلی منزل میں وہ اونٹ بن جاتی ہے، دوسری میں ببر اور تیسری میں بچہ کی شکل اختیار کرتی ہے۔ اونٹ نہایت صبر و تحمل کے ساتھ بوجھ اُٹھاتا اور ذمہ داریوں کو قبول کرتا ہے۔ پھر صبر اور اطاعت کے اِس دور سے گزر کر روح خود ارادیت کی منزل میں داخل ہوتی ہے جہاں وہ ببر بنتی ہے اور اُس کی آزاد مرضی قانون ہو جاتی ہے۔ لیکن نئی قدروں کی تخلیق کے لئے ماضی کو بھلا دینا ضروری ہوتا ہے۔ اور بچہ چونکہ معصومیت کا پیکر ہوتا ہے جس کے نزدیک ماضی کا کوئی تصوّر نہیں ہوتا اس لیئے روح بالآخر بچہ بن جاتی ہے اور زندگی کو ایک معصوم کھیل سمجھکر اُس کی از سرِ نو ابتدا کرتی ہے — نٹشے کی اِن تین منزلوں سے اقبال صرف پہلی منزل اخذ کرتے ہیں۔ قرآن میں بھی اونٹ کا ذکر آیا ہے — فانظر الی الابل کیف خلقت — یعنی دیکھو کہ اونٹ کس طرح بنایا گیا ہے۔ اِس اونٹ میں اقبال کے پہلے دو مرحلے یعنی اطاعت اور ضبطِ نفس موجود ہیں۔ لیکن انھوں نے نٹشے کے ببر کو نظر انداز کر دیا ہے۔ البتہ نیابتِ الٰہی کا مرحلہ اُس کی بچہ والی صورت سے ملتا جلتا ہے۔

اقبال اونٹ کے صبر و استقلال کی تعریف کرتے ہیں اور اُسکی سنجیدگی اور سخت کوشی کی وضاحت کرتے ہوئے اطاعت کی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اعلیٰ اور سچّی حریّت پابندیِ فرائض سے پیدا ہوتی ہے۔ اِسی سے افراد کی ترقی میں مدد ملتی ہے اور اتباعِ قانونِ قدرت ہی سے عناصرِ فطرت پر فتحیابی ممکن ہے۔

در اطاعت کوش اے غفلت شعار — می شود از جبر پیدا اختیار
ناکس از فرماں پذیری کس شود — آتش ار باشد ز طغیاں خس شود
ہر کہ تسخیرِ مہ و پرویں کند
خویش را زنجیریِ آئیں کند

ہوا جب پھول کے جسم میں مقید ہوتی ہے تو خوشبو بن جاتی ہے اور بو جب نافۂ آہو میں مستور ہوتی ہے تو مشک میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس لئے اعلیٰ مدارج کے حصول کی خاطر انسان کو بھی چاہیئے کہ آئین کی حدود میں رہے اور اس سے باہر جانے کی کوشش نہ کرے ــــ!

باد را زندانِ گل خوشبو کند — قید بو را نافۂ آہو کند
شکوہ سنجِ سختیِ آئیں مشو — از حدودِ مصطفےٰ بیروں مرو

ضبطِ نفس انسان اگر اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتا تو وہ غیر کے بس میں چلا جاتا ہے۔

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں
می شود فرماں پذیر از دیگراں،

ضبطِ نفس کے لئے اسلام نے بہترین اصول پیش کئے ہیں۔ اقبال شخصیت کے استحکام کے لئے ان پر عمل کرنے کی ہدایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ روزہ سے بھوک و پیاس پر قابو اور تن پروری کی خواہش پر غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ حج وطن کے تصور کو جو کہ اسلامی روح کے خلاف ہے مٹا کر ہجرت کیلئے انسان کو تیار رکھتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ دولت کی محبت کو فنا کر دیتی ہے

اور نوعِ انسان میں مساوات کا احساس پیدا کرتی ہے ۔۔ اسلام کے یہ اصول انسان کے ذہن و فکر سے تخریبی رجحانات کو زائل اور زہریلے مادہ کو خارج کر کے اُس کی روح کو پاکیزہ اور خودی کو طاقتور کر دیتے ہیں ۔۔!

روزہ بر جوع و عطش شبخوں زند　　　　خیبرِ تن پروری را بشکند

مومناں را فطرت افروز است حج　　　　ہجرت آموز و وطن سوز است حج

حبِ دولت را فنا سازد زکوٰۃ　　　　ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ

ایں ہمہ اسبابِ استحکامِ تست

پختہ محکم اگر اسلامِ تست

نیابتِ الٰہی

اطاعت اور ضبطِ نفس کے مرحلوں سے گزر کر انسان نیابتِ الٰہی کی ذمہ داریاں قبول کرتا ہے ۔ اس نوبت پر اشیاء کی حقیقت اُس پر منکشف ہوتی ہے اور وہ عناصرِ فطرت پر حکمرانی حاصل کر لیتا ہے ۔!

نائبِ حق در جہاں بودن خوش است　　　　بر عناصر حکمراں بودن خوش است

نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است　　　　ہستیِ او ظلِّ اسمِ اعظم است

از رموزِ جزو کُل آگہ بود

در جہاں قائم بامر اللہ بود

اِس نائب الٰہی کی فطرت اپنے لئے نت نئے مظاہر تلاش کرتی ہے ۔ اِس کی فکرِ بلند کائنات کو مسخر کر لیتی ہے اور بے شمار عالم اُس کے تخیل میں پھول کی طرح کھِل جاتے ہیں ۔۔۔!

فطرتش معمور و می خواہد نمود　　　　عالمے دیگر بیارد در وجود ،

صد جہاں مثلِ جہانِ جزو و کل　　　　روید از کشتِ خیالِ او چو گُل

مردِ کامل نیابتِ الٰہی کے اسی اسلامی تصور پر اقبال کے مردِ کامل کا تصور مبنی ہے۔ انسان تخلیق اقدار کا سرچشمہ اور کائناتِ ہستی کا عظیم ترین مظہر ہے۔ اسی لیے اس نے خلافتِ الٰہی کی ذمہ داری کو قبول کر لیا ہے۔ لیکن اس مقدس ذمہ داری کی تکمیل ہر انسان نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے "انسانِ کامل" کی ضرورت ہوتی ہے جس کی خاطر تمام کائنات منتظر رہتی ہے۔ نرگس ہزاروں سال اپنی بے نوری پہ روتی ہے اور آسمان کی آنکھیں اس کے لیے صدیوں کھلی رہتی ہیں ——!

تو کیستی ز کجائی کہ آسمانِ کبود
ہزار دیدہ براہ تو از ستارہ کشود

اسلام نے انسانی کمال اور فضیلت کے اصول کو تسلیم کیا ہے اور اس حقیقت کو پوری طرح واضح کر دیا ہے کہ تمام کائنات انسان کے تابعِ فرمان ہے ——،

هو الذی خلق لكم ما فی الارض جمیعًا

یعنی اسی نے تمہارے لیے جو کچھ زمین میں ہے بنایا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ہے کہ

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ۝ ثُمَّ رددنٰهُ اسفلَ سَافِلِیْنَ ۝ الا الذین اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۝

یعنی ہم نے انسان کو بہترین اعتدال پر پیدا کیا۔ پھر ہم اس کو نیچے سے نیچے پہنچا دیتے ہیں، لیکن وہ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے ——

اِن آیات کا مطلب یہہ ہے کہ وہی انسان عظمت و بزرگی حاصل کر سکتا ہے جس کا ایقان محکم اور عمل نیک ہو۔ چنانچہ اسلام نے ایسی ہی بلند شخصیتوں کی تخلیق پر زور دیا ہے اور انہی کو نیابت الٰہی کی ذمہ داری سونپ دی ہے ــــ نیابتِ الٰہی کے اس قرآنی تصوّر پر اقبال نے انسانِ کامِل کے تصور کی بنیاد رکھی ہے اور اس کی تعبیر میں چند اسلامی مفکّرین سے بھی امداد حاصل کی ہے۔

شیخ محی الدین ابن العربی کا انسانِ کامل بجائے خود ایک عالم ہے کیونکہ وہ خدا کی تمام صفات اور کمالات کا مظہر ہے۔ وہ حقیقت کی ایک مختصر تصویر ہے۔ خدا سے مکمل اتحاد و یگانگت کے باعث اُسے یہہ مقام نصیب ہوتا ہے ــــ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسانِ کامِل کا کمال کیا ہے! وہ اپنے علم میں کامل ہوتا ہے یا اپنے وجود میں؟ یا ان دونوں میں کمال حاصل کرتا ہے؟ یا خدا کا کامل مظہر ہونے کی وجہ سے کامل ہے؟ یا محض اپنی عارفانہ کیفیّت میں وہ خدا سے یگانگت محسوس کرتا ہے! ابن العربی ان صورتوں کو مخلوط کر دیتے ہیں ــــ اپنی کامل حیثیّت میں انسان خدا کا ایک عکس ہے۔ وہ ایک آئینہ ہے جو خدا کی تمام صفات کو منعکس کرتا ہے۔ روحانی تربیت اور صوفیانہ مشقت سے یہ کمال حاصل ہوتا ہے۔ اِس ترقی کے تین مدارج ہیں۔ پہلے درجہ میں انسان خدا کے اسماء پر غور کرتا ہے۔ دوسرے میں اس کی صفات کو جذب کر کے معجزانہ طاقت حاصل کرتا ہے اور تیسرے درجہ میں وہ اسمار اور صفات سے متجاوز ہو کر جوہر کے دائرہ میں داخل ہوتا ہے اور انسانِ کامل بن جاتا ہے۔ اب یہ وہ مقام ہے جہاں اُس کی آنکھ خدا کی آنکھ، اُس کی زبان خدا کی زبان، اُس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ اور اُس کی حیات خدا کی حیات

بن جاتی ہے! اسی تصور کو اقبال نے نہایت حسین پیرایہ میں اس طرح پیش کیا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ غالب و کار آفریں، کار کشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

مولانا جلال الدین رومی کے ہاں بھی مردِ کامل کا ایک بصیرت افروز تصوّر موجود ہے۔ مردِ کامل کی تلاش پر وہ بہت زور دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ:۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر کز دام و دد[1] ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما،
گفت آں کہ یافت می نشود آنم آرزوست

رومی فرماتے ہیں کہ مردِ کامل اپنی غیر فانی حیثیت کو سمجھتا ہے۔ اُس کا خدا سے راست تعلق ہوتا ہے۔ پیغمبر اور فرشتے درمیان میں حائل نہیں ہوتے۔ اُس سے کرامات بھی سرزد ہوتی ہیں۔ آدم علیہ السلام بھی مردِ کامل تھے جن کے آگے فرشتوں نے سرِ تسلیم خم کیا ہے۔ اقبال اور رومی دونوں کے نزدیک کسی شخص کا مردِ کامل بن جانا ممکن ہے۔

---

[1] اگرچہ کتابوں میں دام و دد ہی لکھا ہوا ہے تاہم صحیح دیو و دد معلوم ہوتا ہے۔

آروبندو گھوش نے بھی اپنی کتاب "فوق البشر" میں مردِ کامل کا تصور پیش کیا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ انسان کے تمام لازمی عناصر میں ایک ملکوتی عنصر ہوتا ہے جس کے ارتقار سے انسان "فوق البشر" ہو سکتا ہے۔ یہ عنصر ذاتِ مطلق کا عکس ہوتا ہے لیکن ذاتِ مطلق اور انسان کے اس جوہر میں اتنا فرق ضرور ہوتا ہے کہ جو چیز اول الذکر میں غیر محدود ہوتی ہے وہ ثانی الذکر میں محدود اور اضافی حیثیت رکھتی ہے —— اقبال اور گھوش اس امر پر متفق ہیں کہ یہہ جوہر کسی جماعت کا حق نہیں ہے۔ یہہ مخصوص لوگوں کا روحانی اجارہ نہیں ہے۔ لیکن دونوں میں فرق یہہ ہے کہ گھوش مردِ کامل کو محض روحانی قوتوں کا ایک مرکز سمجھتے ہیں اور اقبال روحانی ترقی کے ساتھ ساتھ جسمانی تربیّت کو بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔

ارسطو کے مثالی انسان (Ideal Man) اور اقبال کے انسانِ کامل میں بھی مماثلت پائی جاتی ہے۔ ارسطو کا مثالی انسان طبعاً نوعِ انسانی کی کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس بات سے شرماتا ہے کہ کوئی انسان اُس کی خدمت کرے۔ اُس کے نزدیک مہربانی برتری کی علامت ہے لیکن کسی سے مہربانی کی درخواست کرنا کمزوری کی دلیل ہے۔ اُس کے دل میں کینہ نہیں ہوتا۔ وہ نقصانات کو فراموش اور گناہوں کو معاف کرتا ہے۔ وہ نہایت دلیر ہوتا ہے۔ اُس کی آواز گہری اور گفتگو نپی تلی ہوتی ہے۔ وہ جلد باز نہیں ہوتا کیونکہ اُسے ضرورت سے زیادہ اُمور کی تکمیل کی ہوس نہیں ہوتی۔ وہ تند مزاج نہیں ہوتا۔ دُنیا کی کوئی بات اُس کی نظر میں مشکل نہیں ہوتی۔ زندگی کے حادثات کو وہ صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کرتا ہے اور ایک قابل سپہ سالار کی طرح اپنے

محدود وسائل کو نہایت دور اندیشی سے استعمال کرتا ہے — ارسطو کے اِس مثالی انسان اور اقبال کے مردِ کامل میں بہت زیادہ مشابہت پائی جاتی ہے ارسطو کی طرح اقبال بھی کسی کا ممنونِ احسان ہونا پسند نہیں کرتے اور حضرت عمرؓ کے کردار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے منتِ غیر سے گریز کی تعلیم دیتے ہیں۔ الحذر از منّتِ غیر الحذر! نیز پاکبازی، نرم مزاجی اور سخت کوشی کو ارسطو ہی کی طرح وہ اپنے انسانِ کامل کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دِل و پاکباز

پروفیسر ای جی براؤن کہتے ہیں کہ اقبال کے تمام فلسفہ کی اساس نٹشے کا فلسفہ ہے اور اُن کا انسانِ کامل نٹشے ہی کے "فوق البشر" کا مثنیٰ ہے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں کے تصورات میں بنیادی فرق ہے۔ اقبال کا مردِ کامل اخلاقی قوانین کی حدود میں اپنی جدوجہد کو جاری رکھتا ہے درآنحالیکہ نٹشے کا فوق البشر اخلاقی پابندیوں سے بے نیاز ہونا چاہتا ہے۔ وہ عظمت، قوت اور حُسن کے تحفظ کے لئے ہر تحدید کو مٹا دینا ضروری خیال کرتا ہے اور ضمیر، گناہ، موت اور دوزخ کے خوف کو زائل کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ وہ جسمانی قوت کو بے حد اہمیت دیتا ہے اور رحم کو مرض یا خود غرضی سے تعبیر کرتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ

"نیکی اور عدل کو تباہ کر دو۔ میری خاطر تباہ کر دو" اور

"خدا (نعوذ باللہ) مرگیا ہے۔ اب ہم تہیہ کر لیں کہ فوق البشر زندہ رہے"

اور "خدا (نعوذ باللہ) مرگیا ہے۔ وہ انسان پر رحم کے سبب سے مرگیا ہے۔ لہٰذا رحم سے خبردار ہو جاؤ"

اس سے ظاہر ہے کہ نطشے کا فوق البشر ایک وحشی اور تشدّد پسند انسان ہے جس کے نزدیک حصولِ اقتدار کا عزم زندگی کا اصلی مقصد ہے۔ اُس میں لطیف احساسات اور اخلاقی اقدار کا فقدان ہے اور ایک مست ہاتھی کیطرح جسے وہ چاہتا ہے تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس اقبال کا انسانِ کامل توانائی کا باشعور مرکز ہے جس کا اصلی مقصد تباہ کاری نہیں بلکہ رواداری ہے۔ خدا سے دشمنی نہیں بلکہ حکومت الٰہیہ کا قیام اور اس پر ہر حملہ کا انسداد ہے نطشے کا یہ خیال کہ روح کا وجود جسم کے بغیر ممکن نہیں، اُس کے فوق البشر کو مادہ پرست بنا دیتا ہے جس کا تمام ارتقا محض جسمانی ہو کر رہجاتا ہے۔ اس کے برعکس اقبال مردِ کامل روح کی اعلیٰ قوتوں کا منبع ہے جو ایمان و یقین کی بدولت مادّہ پر قابو اور رزمگاہِ حیات میں کامیابی حاصل کرتا ہے۔ وہ جسمانی قوّت کو منتہائے نظر نہیں قرار دیتا بلکہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے اسے ایک ذریعہ خیال کرتا ہے۔ اُس کے تنِ محکم میں ایک دردمند، خدابیں اور خداترس دِل ہوتا ہے جو معاشرہ کی فلاح و بہبود کو اپنا فرض اور حکومتِ الٰہیہ کے قیام کو اپنا نصب العین سمجھتا ہے۔

اقبال کا مردِ کامل رنگ برنگ کی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اُس کے کردار کا جوہر نہایت درخشاں اور تابناک ہے۔ اُس کی فکر میں برق کی توانائی اور آنکھوں میں شعاعِ آفتاب ہے۔ اُس کی قوّتِ ارادی کائنات پر مرکوز ہو

اُسے مسخر کر لیتی ہے اور اُس کی ایک نگاہ قوموں کی نکر میں زلزلہ ڈال کر اُن کی تقدیر کو بدل دیتی ہے ——!

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں!

یہ مردِ کامل نٹشے کے فوق البشر کی طرح وحشت پسند نہیں ہے بلکہ جلال وجمال کا ایک حسین اور خوشگوار مرکّب ہے۔ مخالفتوں کو وہ آندھی کی طرح اُڑا لیجاتا ہے، باطل کو طوفان کی طرح بہا لیجاتا ہے، کائنات کی حقیقتوں کو اپنے خونِ جگر سے سینچتا ہے اور پھُول کی سی لطیف قدروں کے لیے شبنم بن جاتا ہے!

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں!

اُس کی ہیبت سے دریا خشک ہو جاتے ہیں۔ غلاموں کو وہ آزادی بخشتا ہے، زندگی کی تفسیرِ جدید کرتا ہے اور انسانیت کے خوابِ پریشاں کو تعبیرِ نو عطا کرتا ہے ——!

خشک سازد ہیبتِ او نیل را   می برد از مصر اسرائیل را
زندگی را می کند تفسیرِ نو   می دہد ایں خواب را تعبیرِ نو

وہ سوارِ اشہبِ دوراں ہے، فروغِ دیدۂ امکاں ہے۔ ایجادات سے وہ زندگی میں رونق پیدا کرتا ہے وہ فطرت کی تسخیر سے انسانیت کو بامِ عروج پر پہنچاتا ہے۔ وہ شورشِ اقوام پر غالب آتا ہے، جنگ وجدل اور خونریزی وغارتگری کا انسداد کرتا ہے اور اُس کے درد بھرے نغمے اہلِ جہاں کو اخوت

و محبّت کا حیات افروز پیام دیتے ہیں۔!

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا　　اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو　　در سوادِ دیدہ ہا آباد شو
شورشِ اقوام را خاموش کن　　نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن
خیز و قانونِ اخوّت باز دہ　　جامِ صہبائے محبّت باز دہ
نوعِ انساں مزرع و تو حاصلی
کاروانِ زندگی را منزلی

موت اِس عالمِ رنگ و بو پر موت کا فرمان جاری ہے۔ کوئی نفس اِس کے پنجۂ آہنی سے بچ نہیں سکتا اور کوئی وجود اس کی خونیں گرفت سے چھوٹ نہیں سکتا۔

کُلّ نفسٍ ذائقۃ الموت

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس موت پر ہر چیز کا خاتمہ ہو جاتا ہے یا موت کے بعد بھی زندگی اور ارتقا کی کوئی صورت موجود ہے ___؟ اسلام کہتا ہے کہ حیات بعدِ موت ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ اور مرنے کے بعد بھی روحانی ارتقا کا سلسلہ بدستور جاری رہتا ہے۔ یعنی موت کے بعد زندگی ایک نیا روپ اختیار کرتی ہے اور اپنی صلاحیّت کے مطابق مراتب حاصل کرتی چلی جاتی ہے۔ اقبال بھی یہی کہتے ہیں کہ انسانی ارتقا کی بیشمار منازل میں موت ایک منزل ہے جو بندۂ حق کے لئے نہایت حسین اور نہایت دلکش واقع ہوئی ہے ___!

بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ
یک مقام از صد مقام اوست مرگ

وہ کہتے ہیں کہ موت خودی کے لئے دراصل پہلی منزل ہے۔ دنیا خودی کا مستقل نشیمن نہیں ہے۔ اِس دنیا کے بعد بھی بے شمار عالم موجود ہیں جو خودی کی یلغار کے منتظر اور اُس کی شوخیٔ فکر و عمل کے آرزومند ہوتے ہیں ــــ!

یہ منزل یہ ہنگامۂ رنگ و صوت | یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت
یہ عالم یہ بتخانۂ چشم و گوش | جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
خودی کی یہ ہے منزلِ اوّلیں | مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر | طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود | کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا
تری شوخیٔ فکر و کردار کا

خودی ــــ زندہ و بیدار خودی ــــ موت کے بعد نہایت سرعت کے ساتھ ارتقائی منازل طے کرتی جاتی ہے۔ جسمِ خاکی مٹی میں مل جاتا ہے اور روح اُن مناصب کی انجام دہی میں مصروف ہو جاتی ہے۔ جو اُس کے سامنے ہوتے ہیں۔ اِن امور کی تکمیل کے بعد وہ لطیف تر ہو کر خالقِ حقیقی کی طرف رجوع کرتی ہے اور اُس اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ جاتی ہے جہاں اُس کا رَبّ اُس سے راضی اور وہ اپنے رب سے راضی ہوتی ہے اور جسے "نفسِ مطمئنہ" سے قرآن مجید میں ظاہر کیا گیا ہے ــــ!

یاایها النفس المطمئنة ارجعی الی ربک راضیتہ مرضیۃ

لیکن جہاں زندہ و بیدار خودی سے زندگی کو روشنی اور روح کو بقائے دوام حاصل ہوتی ہے وہاں خودی کی موت نہ صرف قوتِ عمل کو زائل کرتی ہے بلکہ انسانیت اور تمام اخلاقی قدروں کی تباہی کا باعث بھی ہو جاتی ہے۔ اسی کے سبب سے مشرق کی قوموں نے غلامی کا طوق اپنی گردن میں ڈال رکھا ہے اور مغربی قوموں کی اخلاقی اور روحانی پستی اسی کا نتیجہ ہے ——!

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور
خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام!

خودی کی موت سے روحِ عرب ہے بے تب و تاب
بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و عظام

خودی کی موت سے ہندی شکستہ بال و پر
قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام!

خودی کی موت سے پیرِ حرم ہوا مجبور
کہ بیچ کھائے مسلماں کا جامۂ احرام!

اقبال کا فلسفۂ بیخودی

فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

فرد کی حیات ملّت کی زندگی سے وابستہ ہے۔ فرد اگر ایک پھُول ہے تو ملّت اُس کے لئے چمن ہے، اور چمن ہی میں یہ پھول ترو تازہ رہ سکتا ہے!

۱۔ تشریح
۲۔ آئیڈیل سوسائٹی
۳۔ وحدت
۴۔ رسالت
۵۔ نظامِ حیات
۶۔ مرکز
۷۔ نصب العین
۸۔ تسخیرِ فطرت
۹۔ روایات
۱۰۔ امومت

اقبالؒ کا فلسفۂ بیخودی

تشریح اقبال کے فلسفۂ خودی کی طرح اُن کا فلسفۂ بیخودی بھی اسلامی تعلیمات ہی سے ماخوذ ہے۔ اس فلسفہ کی روح یہہ ہے کہ فرد اپنی خودی کو آئینِ ملت کا پابند کر کے نوعِ انسانی کے اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول کے لیے خود کو وقف کر دے ___ خودی کے پہلے دو مرحلوں یعنی اطاعت اور ضبطِ نفس سے گزر کر انسان نیابتِ الٰہی کی منزل میں جب داخل ہوتا ہے تو اُسے یہہ محسوس ہوتا ہے کہ ملّت کی اخلاقی قدروں کے بغیر تکمیلِ ذات ناممکن ہے۔ چنانچہ وہ معاشرہ کی پابندیاں خود پر عائد کر لیتا ہے اور انہی حدود میں اپنی جدوجہد کو جاری رکھتا ہے۔ درحقیقت یہہ تحدیدات خودی کے ارتقا میں نظم و ضبط پیدا کرتی ہیں اور شخصیت کو صالح بنیادوں پر استوار کرنے میں ممد و معاون ہوتی ہیں۔ اِن کے بغیر نہ خودی کی صحتمند پرورش ممکن ہے اور نہ کردار میں دلکشی اور جاذبیت پیدا ہو سکتی ہے۔

فرد را ربطِ جماعت رحمت است
جوہرِ او را کمال از ملت است

افراد کی زندگی عارضی ہوتی ہے لیکن قومیں اپنی صحتمند اور بلند حوصلہ نسلوں کے ذریعہ قائم رہتی ہیں۔ افراد کی موت سے مِلّت کی حیات متاثر نہیں ہوتی۔ اقبال کہتے ہیں کہ گُل و نسترن کے مُرجھانے سے فصلِ بہار پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ ایک ہیرے کے نکال لئے جانے سے ہیرے کی کان خالی نہیں ہو سکتی۔ اور روز و شب کے بیشمار جام تقسیم کیِے جانے کے باوجود خُمِ ایّام میں کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی۔

فصلِ گل از نسترن باقی تر است — از گُل و سرو و سمن باقی تر است
کانِ گوہر پرورے گوہر گرے — کم نہ گردد از شکستِ گوہرے
صبح از مشرق، ز مغرب شام رفت — جامِ صد روز از خُمِ ایّام رفت
بادہ ہا خوردند و صہبا باقی است
دوش ہا خوں گشت و فردا باقی است

اسی طرح فرد کی تقویم بے ثبات ہوتی ہے۔ لیکن مِلّت کی تقویم زیادہ پائدار اور مضبوط ہوتی ہے۔ دُنیا میں فرد ایک مسافر کی حیثیّت رکھتا ہے لیکن مِلّت ایک مستقل شئے ہے۔

ہم چناں از فرد ہائے بے سپر — ہست تقویمِ امم پائندہ تر
در سفر بار است و صحبت قائم است — فرد رہ گیر است و مِلّت قائم است

اس لئے اعلیٰ ترین مقاصد کی خاطر افراد میں ایثار، قربانی اور بیخودی کے جذبہ کی تخلیق ضروری ہے تاکہ افراد کے عزم و عمل سے صرف ایسی اخلاقی قدریں معرضِ وجود میں آسکیں جس سے اجتماعی زندگی کو توازن و ہم آہنگی نصیب ہوتی ہے۔

یہی اقبال کا تصورِ بیخودی ہے۔

اس سلسلہ میں فرد اور ملّت کا باہمی رشتہ کا تعیّن بھی ضروری ہے بعض انفرادیت پسند مفکرین مثلاً کانٹ، نٹشے اور برگساں کے نزدیک فرد کا ارتقا زندگی کا مقصود اور ملت اس کا ذریعہ ہے۔ اس کے برعکس ہیگل اور اُس کے ماننے والے ملّت کو فرد پر اور اجتماعی مقاصد کو انفرادی اغراض پر فوقیت دیتے ہیں۔ برگساں کے نزدیک انفرادی انا کے باہر احساس و ادراک کا وجود نہیں ہے، اور ہمارے حقیقی وجود سے باہر عمرانی زندگی ایک مصنوعی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انفرادی احساس ہی حقیقت کا حامل ہے لیکن اس حقیقت کی پرورش صرف ملّت کے اندر ہی ممکن ہے، اور ملّت کا تصوّر اجتماعی ذمہ داری اور فرائض کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اقبال نے ہیگل اور برگساں کے زاویہ ہائے نگاہ کے درمیان ایک متوازن نقطۂ نظر قائم کیا ہے۔ اُنہوں نے فرد اور جماعت کے ظاہری تضاد کو رفع کر کے دونوں کو ایک دوسرے کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فرد کی حیات ملّت کی زندگی سے وابستہ ہے۔ فرد اگر ایک پھول ہے تو ملّت اس کے لئے چمن ہے، اور اس چمن ہی میں یہ پھول تر و تازہ رہ سکتا ہے۔

در جماعت فرد را بینیم ما	از چمن او را چو گل چینیم ما
فطرتش وارفتۂ یکتائی است	حفظِ او از انجمن آرائی است

فرد اور ملّت کا باہمی تعلق نہایت گہرا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے آئینہ ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں فرد جب جماعت میں

گم ہو جاتا ہے تو اُس کی شخصیت بھی وسیع تر ہو جاتی ہے۔

فرد و قوم آئینۂ یک دیگر اند، سلک و گوہر کہکشاں و اختر اند
فرد می گیرد ز ملّت احترام، ملّت از افراد می یابد نظام

فرد تا اندر جماعت گُم شود
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

انسانی شخصیّت اپنے ارتقا کے لئے جماعت کی محتاج ہوتی ہے۔ یہ ارتقا جماعتی تمدّن سے نشو و نما کے حصول کے بغیر ناممکن ہے۔

در جماعت خود شکن گردد خودی
تا ز گلبرگے چمن گردد خودی

اقبال کہتے ہیں کہ :-

"فرد اس جماعت کی زندگی میں جس کے ساتھ اُس کا تعلق ہے بمنزلہ ایک عارضی لمحہ کے ہے۔ اس کے خیالات، اُس کی تمنّائیں، اُس کا طرزِ ماند و بود، اس کے جملہ قوائے دماغی و جسمانی بلکہ اس کے ایّامِ زندگی کی تعداد تک اس جماعت کی ضروریات و حوائج کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہوتی ہے جس کی حیاتِ اجتماعی کا وہ محض ایک جزوی مظہر ہے۔ فرد کے افعال کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ بہ سبیلِ اضطرار و بلا ارادہ کسی خاص کام کو جو جماعت کے نظام نے اس کے سپرد کیا ہے انجام دیتا ہے ___ قوم ایک جداگانہ زندگی رکھتی ہے۔ یہ خیال کہ اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ یہ اپنے موجودہ افراد کا محض

ایک مجموعہ ہے اصولاً غلط ہے اور اسی لئے تمدّن و سیاسی اصلاح کی وہ تمام تجاویز جو اس مفروضہ پر مبنی ہوں بہت احتیاط کے ساتھ نظرِ ثانی کی محتاج ہیں۔ قوم اپنے موجودہ افراد کا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بہت کچھ بڑھ کر ہے۔ اس کی ماہیئت پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ غیر محدود و لامتناہی ہے کیونکہ اس کے اجزائے ترکیبی میں وہ کثیر التعداد آنے والی نسلیں بھی شامل ہیں جو اگرچہ عمرانی حدِ نظر کے فوری منتہا سے آگے واقع ہیں تاہم ایک زندہ جماعت کا سب سے زیادہ اہم جزو متصور ہونے کے قابل ہیں"

(ملّتِ بیضا پر عمرانی نظر)

اس اعتبار سے ملّت کا استحکام ایک اعلیٰ قدر ہے۔ خود فرد کا وجود ملّت کے بغیر بے معنی ہے۔ اُس کے دل میں ذوقِ نمو ملّت ہی کے سبب سے پیدا ہوتا ہے، اسی سے اُس کی عزّت ہے اور اسی کی بدولت وہ اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کر سکتا ہے۔

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

آئیڈیل سوسائٹی اس نوبت پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس قسم کی سوسائٹی خودی کے ارتقاء کے لئے سازگار ہے اور کونسا معاشرہ انفرادی اور اجتماعی ترقی کا ضامن ہو سکتا ہے؟ —— اقبال کے نزدیک آئیڈیل سوسائٹی کے لئے امورِ ذیل کی ضرورت ہے۔

۱۔ وہ روحانی اقدار مثلاً اصولِ وحدت کی بنیاد پر قائم ہو۔

۲۔ رسالتؐ اس کا محور ہو۔

۳۔ اُس کا اپنا نظامِ حیات ہو۔

۴۔ اُس کا ایک مرکز ہو

۵۔ ایک نصب العین اُس کے سامنے ہو۔

۶۔ تسخیرِ فطرت اُس کی جدوجہد میں شامل ہو۔

۷۔ وہ اپنی روایات کو محفوظ رکھتی ہو۔

۸۔ اموموت کا وہ احترام کرتی ہو۔

وحدت کسی عظیم تر ملّت کی تعمیر کے لئے روحانی بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ مضبوط بنیاد ہمیں صرف وحدت کے تصور ہی میں مل سکتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ:۔

"جدید تمدّن عالمی اتحاد کے لئے 'اصولِ توحید' کو بنیاد بنا سکتا ہے اور اسلام ایک مکمّل نظامِ حیات کی حیثیت سے اِس اصول کو انسانی ذہن میں زندہ شکل دے سکتا ہے۔ اسلامی تعلیم کے مطابق خدا کے ساتھ وفاداری ضروری ہے نہ کہ تخت و تاج کے ساتھ۔ اور چونکہ ہر زندگی کی اصلی روحانی اساس ذاتِ باری تعالیٰ ہے اِس لئے باری تعالیٰ سے وفاداری کا مطلب انسان کی خود اپنی فطرت کے ساتھ وفاداری ہے۔"

اس طرح عقیدۂ توحید ایک فطری عقیدہ ہے جو نہ صرف فرد کے لئے قابلِ قبول ہے بلکہ ملّت کو ایک ایسی نفسیاتی اساس بھی فراہم کرتا ہے جس پر اخلاقی قدروں کی تعمیر سے قوم کو طاقت اور عظمت حاصل ہو سکتی ہے — وہی دین و مذہب۔

علم و حکمت، آئین و دستور، فکر و تجسّس اور جذباتِ عشق و محبت انسانیت کے لئے مفید اور کارآمد ہو سکتے ہیں جن کی بنیاد اصولِ وحدت پر رکھی گئی ہو۔ عقیدۂ توحید انسان کے لئے مہمیز کا کام کرتا ہے اور اس کے جذبۂ عمل کو بڑھاتا ہے۔ اس کے خوف اور ہراس کو زائل کرتا ہے اور اس کے ضمیر کو روشن اور مقامِ عبدیت کو محکم کر کے رموزِ کائنات کو اس پر منکشف کر دیتا ہے——!

اہلِ حق را رمزِ توحید از بر است | در اتی الرّحمٰنِ عبداً مضمر است
دیں ازو حکمت ازو آئیں ازو | زور ازو قوّت ازو تمکیں ازو
عالماں را جلوہ اش حیرت دہد | عاشقاں را بر عمل قدرت دہد
قدرتِ او بر گزیند بندہ را | نوعِ دیگر آفریند بندہ را
در رہِ حق تیز تر گردد تگش | گرم تر از برق خوں اندر رگش
بیم و شک میرد عمل گیرد حیات | چشم می بیند ضمیرِ کائنات

چوں مقامِ عبدہٗ محکم شود
کاسۂ دریوزہ جامِ جم شود

عقیدۂ توحید تمام رجعت پسند قوتوں کا ازالہ کرتا ہے، استوار بنیادوں پر انسانی ذہن کی تربیت کرتا ہے، اور انسان کے لئے ایسی روحانی قدریں فراہم کرتا ہے کہ جن سے ملّت کو اتحاد اور استقلال نصیب ہو سکتا ہے۔ لا الٰہ کا تصوّر انسانی فکر کے لئے ایک مشترک اساس بہم پہنچاتا ہے جس کی بدولت افراد کا احساسِ بیگانگی رفع ہو کر اتحاد و یگانگت کی فضا پیدا ہوتی ہے جو عظیم تر ملّت کے قیام کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ وہی قوم پھول اور پھل سکتی ہے

جس کے اغراض و مقاصد مشترک ہوں، جس کے جذبات و وجدانات یکساں ہوں اور جس کے خیر و شر کے معیار میں مکمل آہنگی ہو — !

ملّت بیضا تن و جاں لا الٰہ　　ساز ما را پردہ گرداں لا الٰہ

لا الٰہ سرمایۂ اسرارِ ما　　رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما

حرفش از لب چوں بدل آید ہمے　　زندگی را قوت افزاید ہمے

دل مقامِ خویشی و بیگانگی است　　شوق را مستی ز ہم پیمانگی است

ملّت از یک رنگیٔ دلہاستے　　روشن از یک جلوہ ایں سیناستے

قوم را اندیشہ ہا باید یکے　　در ضمیرش مدّعا باید یکے

جذبہ باید در سرشتِ او یکے
ہم عیارِ خوب و زشتِ او یکے

کوئی جماعت جو انسانی برادری کی اساس پہ قائم نہ ہو ہمیشہ ناکام و نامراد رہتی ہے۔ لیکن آج کل رنگ و نسل، وطن اور جغرافیہ کی قدروں پر اقوام کی بنیاد رکھی جا رہی ہے جو انسانیت کے انتشار اور مفادات کے ٹکراؤ کا باعث ہو رہی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ غیر تربیت یافتہ فکرِ انسانی ہمیشہ بتوں کی تلاش میں رہتی ہے اور ہمیشہ تازہ خداؤں کی تخلیق کرتی رہتی ہے۔ اِن تازہ خداؤں میں سب سے بڑا وطن کا تصوّر ہے جو اسلام کی رُوح کو فنا کر دیتا ہے۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

نئے بتوں میں رنگ و نسب کے بُت بھی شامل ہیں جن کی قربان گاہ پر آدمیت کو بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔

فکرِ انساں بُت پرستے بُت گرے — ہر زماں در جستجوئے پیکرے
باز طرحِ آذری انداخت است — تازہ تر پروردگارے ساخت است
کاید از خوں ریختن اندر طرب — نام او رنگ است وہم ملک ونسب
آدمیت کشتہ شد چوں گوسفند
پیشِ پائے ایں بُتِ ناارجمند

اس خطرناک صورتِ حال کا علاج اقبال کے نزدیک تصوّرِ توحید کی تبلیغ ہے جو انسانی پیچیدہ مسائل کو حل بھی کر سکتا ہے اور عہدِ حاضر کی تاریکی میں روشنی بھی فراہم کر سکتا ہے ——!

اے کہ خوردستی زمینائے خلیلؑ — گرمیٔ خونت ز صہبائے خلیلؑ
بر سرِ ایں باطلِ حق پیرہن — تیغِ لا موجود الاّ ھُو بزن
جلوہ در تاریکیِ ایام کُن
آنچہ بر تو کامل آمد عام کُن

انڈین نیشنل کانگریس جغرافیہ کی بنیاد پر قوم کی تشکیل اور برِ اعظم ہند کی آزادی کی خواہشمند تھی۔ مولانا حسین احمد مدنی نے جو کانگریس کے ایک سرگرم کارکُن تھے، اپنے ایک خطبہ میں اس امر پر زور دیا تھا کہ مِلّت کا تصوّر "وطن" کے تصوّر کے تابع رہنا ہے اور بغیر وطن کے کسی مِلّت کا وجود ناممکن ہے —اس پر اقبال کو بڑا تعجب ہوا اور اُنہوں نے چند برجستہ اشعار میں مولانا پر تنقید کرتے ہوئے فرمایا کہ مولانا کا یہ خیال محمدِ عربی کی تعلیمات کی روح سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے اور یہی ناواقفیت تمام خرابیوں کی باعث ہے —!

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ،   زدیوبند حسین احمدؔ ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است   چہ بے خبر ز مقامِ محمدِؐ عربی است
بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است!

رسالت

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کسی قوم کے لئے ہر دور میں بہترین قیادت کا حاصل رہنا ضروری ہے۔ اچھے اور برے قائدین پیدا ہوتے رہتے ہیں اور جو اچھے ہوتے ہیں اُن کے ہر اقدام کا مفید ہونا بھی ضروری نہیں ہے کیونکہ انسان کی عقل غیر مکمل اور بصیرت محدود ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ قائدین کی ذرا سی لغزش سے قومیں تباہ اور ملّتیں برباد ہو جاتی ہیں —— اس لئے اقبال کہتے ہیں کہ کسی ملت کی کامیابی کی ضمانت صرف الہامی قیادت Inspired Leadership ہی سے ہو سکتی ہے جس کی بہترین شکل رسالت ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہماری ملت کی بنیاد رکھی۔ اس ملت کی قیادت اللہ کے رسولوں کے ہاتھ میں رہی، یہاں تک کہ آقائے نامدار حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس اُمت کے آخری قائد بن کر آئے اور دنیا کے لئے ایک واضح شریعت اور ایک مکمل نظامِ حیات عطا کر گئے!

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولِ ما رسالت ختم کرد

رسول کی ذات سے محبت تمام اختلافات کو مٹا کر سوسائٹی کی تقویت میں ممد و معاون ہوتی ہے۔ پیغمبرِ اسلام کا ہم پر یہ احسان ہے کہ ان کے عشق نے

ہم سب کو ہمنوا اور ہم مدّعا کر کے ہماری ملّت کو وحدت اور زندگی بخشی ہے۔!

از رسالت ہم نوا گشتیم ما
ہم نفس ہم مدّعا گشتیم ما

کثرتِ ہم مدّعا وحدت شود
پختہ چوں وحدت شود ملّت شود

زندہ ہر کثرت ز بندِ وحدت است
وحدتِ مُسلم ز دینِ فطرت است

دینِ فطرت از نبی آموختیم
در رہِ حق مشعلے افروختیم

ایں گہر از بحرِ بے پایانِ اوست
ما کہ یکجانیم از احسانِ اوست

جب کوئی مِلّت رنگ و نسل، وطن و جغرافیہ کی مادی بنیادوں پر نہیں بلکہ وحدت اور رسالت کی اساس پر قائم ہوتی ہے تو وہ زبان و مکان کی تحدیدات سے آزاد ہو کر اَبدی اور لافانی ہو جاتی ہے۔ وہ اندرونی مرکز گریز عناصر کو کچل دیتی ہے اور بیرونی دشمن کا قلع قمع کر کے موت کے حملوں کا رُخ پھیر دیتی ہے۔!
رسولِ اکرم کی اُمّت کا جوہر جغرافیہ اور مقام سے وابستہ نہیں رہا۔ آپؐ کے غلام دُنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلتے چلے گئے۔ مسلمانوں کی اذانیں بر و بحر اور کوہ و صحرا میں گونجتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ طارقؓ نے اندلس پر اپنی فوجیں اُتار دیں اور دُشمن کے ساحل پر اپنے جہازوں کو آگ لگا دی۔ لوگوں نے پوچھا کہ وطن کو واپسی کی کیا صورت ہوگی جبکہ سفینہ نذرِ آتش ہو چکا ہے، اور یہہ ترکِ سبب شریعت میں کہاں جائز ہے؟۔
طارق کی آنکھوں میں بجلی کی چمک پیدا ہوئی، ایک ملکوتی تبسّم اس کے ہونٹوں پر رونما ہوا، اور اُس نے اپنی تلوار کو نیام سے کھینچتے ہوئے کہا کہ کرۂ ارض کا چپہ چپہ جس پر کہ خدائے قدوس کی حکومت ہے، غلامانِ محمدؐ عربی کا اپنا وطن اور اپنا گھر ہے!!

طارقؒ چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت ۔۔۔ گفتند کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطاست
دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم! ۔۔۔ ترکِ سبب ز روئے شریعت کجا رواست؟
خندید و دستِ خویش بہ شمشیر برد و گفت
ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

رسول اللہؐ نے مکّہ سے ہجرت کر کے ملّتِ اسلامیہ کی اصلیت کو منکشف فرمایا ہے اور یہ واضح کر دیا ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کی بنیاد کلمۂ توحید ہے اور تمام روئے زمین اُس کی جولانگاہ ہے۔

جوہرِ ما با مقامے بستہ نیست ۔۔۔ بادۂ تندش بجامے بستہ نیست
ہندی و چینی سفالِ جامِ ماست ۔۔۔ رومی و شامی گلِ اندامِ ماست
عقدۂ قومیّتِ مسلم کشود ۔۔۔ از وطن آقائے ما ہجرت نمود،
حکمتش یک ملّتِ گیتی نورد ۔۔۔ بر اساسِ کلمۂ تعمیر کرد
تا ز بخششہائے آں سلطانِ دیں
مسجدِ ما شد ہمہ روئے زمیں،

ایسی ملّت جو روحانی قدروں پر قائم ہوتی ہے وقت کے پنجۂ آہنی سے بھی محفوظ رہتی ہے۔ خود خدائے قدیر ایسی ملّت کی حفاظت کرتا ہے اور اُسے اپنے لطف و کرم سے طاقت و توانائی پہنچاتا رہتا ہے ۔۔۔!

از اجل ایں قوم بے پروا ستے ۔۔۔ استوار از نَحْنُ نَزَّلْنَا ستے
تا خدا اَنْ یُّطْفِؤُا فرمودہ است ۔۔۔ از فسردن ایں چراغ آسودہ است

ملّتِ اسلامیہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نسبت ہے جن کے عشقِ حقیقی نے

نارِ نمرود کے شعلوں کو گلستاں میں تبدیل کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انقلابِ زمانہ کے سبب سے جتنے شعلے بلند ہوتے ہیں وہ ہمارے دماغ میں پہنچ کر بہار بن جاتے ہیں، ہر مصیبت کو ہم برداشت کر لیتے ہیں اور ہر مشکل ہمارے لئے آسان ہو جاتی ہے۔ ہم سے پیشتر متعدد قومیں صفحۂ ہستی پہ نمودار ہوئیں، لیکن گردشِ ایام نے اُن کے وجود کو مٹا دیا۔ رومیوں کی عظمت باقی نہیں رہی، یونانیوں کی رونق ماضی کے سینے میں دفن ہو گئی، ساسانیوں کا جلال خون کی موجوں میں غرق ہو گیا اور مصریوں کا جبروت موت کی آندھیوں میں اُڑ گیا ــــ! لیکن موت و حیات کی کشمکش، اغیار کی وحشت و بربریت اور خونیں انقلابات کے باوجود ملتِ اسلامیہ آج بھی سطح ارض پہ بدستور قائم ہے، اُس کا نظامِ حیات آج بھی موجود ہے اور اُس کی اذانیں آج بھی فضائے بسیط میں بدستور گونج رہی ہیں ــــ!

زانکہ ما را فطرتِ ابراہیمی است ... ہم بہ مولیٰ نسبتِ ابراہیمی است
از تہِ آتشِ بر اندازیم گُل ،، ... نارِ ہر نمرود را سازیم گُل
شعلہ ہائے انقلابِ روزگار ... چو بباغِ ما رسد گردد بہار
رومیاں را گرمِ بازاری نماند ... آں جہانگیری جہانداری نماند
شیشۂ ساسانیاں در خوں نشست ... رونقِ خمخانۂ یوناں شکست
مصر ہم در امتحاں ناکام ماند ... استخوانِ او تہِ اہرام ماند

در جہاں بانگِ اذاں بود ست و ہست
ملتِ اسلامیاں بود ست و ہست

نظامِ حیات | ملت کے استحکام اور مفادات کی ہم آہنگی کے لئے ایک معین آئین

اور واضح نظامِ حیات کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ پنکھڑیوں میں ایک آئین کے تحت نظم قائم ہوتا ہے تو وہ پھول بن جاتی ہیں، پھول ایک ترتیب کے تحت گلدستہ بن جاتے ہیں اور آواز میں ضبط سے نغمہ پیدا ہوتا ہے ——!

برگِ گُل شد چوں ز آئیں بستہ شد　　　گُل ز آئیں بستہ شد گلدستہ شد

نغمہ از ضبطِ صدا پیداستے　　　ضبط چوں رفت از صدا غوغاستے

اسی طرح اقبال کے نزدیک ملّت کی ترقی کے لئے آئین سے وابستگی لازمی ہے وہ کہتے ہیں کہ :۔

”حیاتِ ملیّہ کا انتہائی کمال یہہ ہے کہ افراد کسی آئینِ مُسلّم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کی حُدود مقرّر کریں تاکہ انفرادی اعمال کا تباین و تناقص مٹ کر تمام قوم کے لئے ایک قلبِ مشترک ہو جائیں“

آئین ہی کے سہارے ملّت مشکلات کا سامنا کرتی ہے اور انقلابات کی آندھیوں میں اِسی کی بدولت اپنے چراغِ حیات کو روشن رکھتی ہے۔ جو ملّت اپنے آئین اور نظامِ حیات کی پابند ہوتی ہے اس کی قدروں کا ایقان بھی اس آئین اور نظامِ حیات کے ساتھ ساتھ نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا رہتا ہے۔ لیکن آئین کی عدم موجودگی میں امدادِ زمانہ سے قدریں بدل جاتی ہیں اور ایک نسل کے واقعات اور حقائق دوسری نسل کی نگاہ میں محض توہمات بن کر رہ جاتے ہیں۔ اپنی تہذیب و روایات پر آنے والی نسلوں کا اعتماد زائل ہو جاتا ہے اور وہ کسی دوسری حوصلہ مند قوم کے طرزِ فکر کی زنجیروں میں گرفتار ہو کر اُس کی غلام بن جاتی ہیں۔

اقبال کے نزدیک کسی ملّت کے لئے بہترین نظامِ حیات قرآن مجید ہے۔

لیکن انھیں شکایت ہے کہ مسلمان دوسروں کی افکار کے رہینِ منت ہو رہے ہیں، اُن کی گفتگو دوسروں سے مستعار لی جارہی ہے اور اُن کی قمریوں کی نوا اور سرو کی تب بھی دوسروں ہی سے حاصل کی گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:۔

عقلِ تو زنجیریٔ افکارِ غیر — در گلوئے تو نفس از تارِ غیر
بر زبانت گفتگو ہا مستعار — در دلِ تو آرزو ہا مستعار
قمریانت را نوا ہا خواستہ
سرو ہایت را قبا ہا خواستہ

ملّتِ اسلامیہ کو غیروں سے کچھ حاصل کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ پیغمبرِ عربی سے پیمانِ وفا اور محبت باندھ لینا کافی ہے —!

اے فلک مشتِ غبارِ کوئے تو — اے تماشہ گاہ عالم روئے تو"
ہمچو موج آتش تہہ پا میروی — "تو کجا بہرِ تماشہ میروی"
طرحِ عشق انداز اندر جانِ خویش
تازہ کُن با مصطفےٰ پیمانِ خویش

اقوام و ملل کو قرآنی نظام سے سربلندی حاصل ہو سکتی ہے۔ قرآن ایک زندہ حقیقت ہے۔ اس کی حکمت لازوال ہے۔ وہ کائنات کے رموز کو کھول دیتا ہے۔ تکوینِ حیات کا وہ بہترین نسخہ ہے۔ کمزور کو قوت، عشق کو پختگی اور غلاموں کو آزادی بخشتا ہے۔ ایک سجدہ کا پابند کر کے ہزاروں سجدوں سے انسان کو نجات دلاتا ہے۔ اور انسانی ذہن و فکر میں اس طرح انقلاب بپا کرتا ہے کہ مجرم پابندِ آئین ہو جاتے ہیں اور راستہ لوٹنے والے مسافروں کی رہبری کرنے لگتے ہیں —!

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست — زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست؟
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات — بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
پختہ تر سودائے خام از زورِ او — در فتد با سنگ جام از زورِ او
می برد پابند و آزاد آورد — صید بنداں را بفریاد آورد
ارج می گیرد ازو نا ارجمند — بندہ را از سجدہ سازد سر بلند
رہزناں از حفظِ او رہبر شدند — از کتابے صاحبِ دفتر شدند

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن.

مرکز — جب تک دِل تمام چیزوں کو تازہ خون پہنچاتا رہتا ہے اُس وقت تک تمام اعضاء میں زندگی رہتی ہے اور وہ ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہوتے. اسی طرح ہر ملّت کے لئے ایسے مرکز کی ضرورت ہوتی ہے جہاں سے اُس کی تمام تمدّنی جدوجہد کے لئے توانائی اور رہنمائی فراہم ہوتی ہو اور جس سے سارے اجزاء کی شیرازہ بندی بھی ممکن ہو. مملکت اور وفاقی اکائیوں کے لئے دارالخلافہ کی اہمیّت اور ضرورت سے کون انکار کر سکتا ہے. بالکل اِسی طرح ایک وسعت پذیر ملّت کے لئے مرکز کی ضرورت بھی شدید ہو جاتی ہے —— دائرہ خواہ کتنا ہی پھیلتا جائے، مرکزی نقطہ اُس میں ترتیب اور ضبط قائم رکھتا ہے. یہی صورت ایک مرکز کی ہے جہاں سے مِلّت کو نظم اور زندگی حاصل ہوتے رہتے ہیں. اقبال کے نزدیک مِلّتِ اسلامیہ کیلئے یہ مرکز مکّہ معظّمہ ہے.

حلقہ را مرکز چو جاں در پیکر است　　خطِ او در نقطۂ او مضمر است

قوم را ربط و نظام از مرکزے　　روزگارش را دوام از مرکزے

راز دار و رازِ ما بیت الحرام

سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرام

مرکز سے کسی قوم کی روایات قائم رہتی ہیں جو اُس کی بقا کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کی اُمّت نے جب اپنے مرکز کو چھوڑ دیا تو وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہوئی۔

عبرتے اے مسلمِ روشن ضمیر　　از مآلِ اُمّتِ موسیٰ بگیر

داد چوں آں قوم مرکز را ز دست　　رشتۂ جمعیّتِ ملّت شکست

یہودیوں نے شاید اِسی خرابی کو محسوس کیا اور بڑی گہری سازش اور بڑی بھاری قیمت پر فلسطین کو حاصل کر کے اپنے لئے ایک مرکز از سرِ نو قائم کر لیا ہے۔

مرکز کے وجود کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی ہو سکتا ہے کہ انگریز قوم پھیلتی گئی اور مختلف ممالک میں بس گئی۔ ہر ملک میں اُس نے اپنے وطن کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی کی۔ لیکن اِس کے باوجود وہ منتشر نہیں ہوئی بلکہ ربط و نظم اور اتحاد و تعاون کی خاطر اُس نے اپنی تمام مملکتوں کا "اتحاد" قائم کیا جو دولتِ مشترکہ کی شکل میں آج بھی موجود ہے۔ لندن اِس دولتِ مشترکہ کا مرکز ہے جہاں سے ان مملکتوں کو فیضان حاصل ہوتا ہے۔

نصب العین صحتمند نصب العین حیاتِ اجتماعی کے انتشار کو رفع کر کے ملّت کی شیرازہ بندی کرتا ہے اور زندگی کو آگے بڑھنے کا موقع نصیب

ہوتا ہے ـــــ!

مدعا گردد اگر مہمیز ما ہمچو صرصر می رود شبدیز ما
مدعا رازِ بقائے زندگی، جمع سیماب قوائے زندگی

چوں حیات از مقصدے محرم شود
ضابطِ اسبابِ ایں عالم شود

مستحکم نصب العین ہماری رگوں میں دورانِ خون کو تیز تر کر دیتا ہے، ہمارے عزم کو پختگی اور حوصلوں کو بلندی عطا کرتا ہے، اور ملت کو جوشِ عمل اور وحدتِ فکر بخش دیتا ہے ـــــ!

گردشِ خونے کہ در رگہائے ماست تیز از سعیِ حصولِ مدعاست
مدعا مضرابِ سازِ ہمت است مرکزے کو جاذبِ ہر قوت است

دست و پائے قوم را جنباند او
یک نظر صد چشم را گرداند او

نصب العین کی بلندی کے تناسب سے ملت کو عظمت اور قوت حاصل ہوتی ہے ـــ دنیا کے مختلف مفکرین کے سامنے مختلف نصب العین رہے ہیں! افلاطون ترکِ دنیا و ترکِ جہد کو انسانی زندگی کا مقصد قرار دیتا ہے۔ عیسائیت رہبانیت کی تعلیم دیتی ہے۔ بدھ مت جسمانی خواہشات کے کچل دیئے جانے میں انسان کی نجات سمجھتا ہے۔ یوگا کا فلسفہ انسان کو میدانِ عمل سے نکال کر پہاڑوں کے غاروں میں پہنچا دیتا ہے۔ اور ٹیگور کی مجہول فکر کے مطابق زندگی کا کوئی خاص مقصد ہی نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

"تمھاری دنیا میں مجھے کوئی کام نہیں ہے۔ میری اس فضول زندگی

سے بے مطلب نغمہ کی سُر ہی نکلتی رہتی ہے۔"
اس کے برعکس بعض فلسفی محض تشدّد یا حصولِ اقتدار کو زندگی کی غرض سمجھتے ہیں۔ عہدِ قدیم کے سیاستدان پنڈت چانکیہ کی تعلیم کے مطابق ہندو قیادت کا فرض ہے کہ ظلم و جبر یا منافقت سازش اور دھوکہ بازی کے ذریعے ساری دنیا فتح کر لے۔
میکیاویلی کے نزدیک زندگی کی بقا کے لئے ہر قسم کا ظلم و استبداد جائز ہے۔ نٹشے حصولِ اقتدار کو انسان کا نصب العین قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اقتدار ہر جائز و ناجائز ذریعہ سے حاصل کرنا چاہیئے اور رحم و کرم کے تصوّر کو ذہن سے نکال دینا چاہیئے ——— لیکن اقبال ایسے تصوّر کی تبلیغ کو مسلمانوں کے لئے نصب العین قرار دیتے ہیں جس سے زیادہ پاکیزہ، زیادہ حسین اور زیادہ شاندار تصوّر کی تشکیل ذہنِ انسانی میں آج تک نہیں ہو سکی ہے۔ یہ نصب العین ایک ایسے بلند و برتر خدا کی وحدت کی تبلیغ ہے جو جبروت و جلال اور حُسن و جمال کا پیکر ہے، جو مارتا ہے تو جلاتا بھی ہے، جبّار ہے تو رحمٰن بھی ہے اور قہّار ہے تو غفّار بھی ہے ——— یہ ایک ایسا خدا ہے جس کی محبّت اپنی مخلوق کے لئے غیر محدود ہے اور جس کی رحمت سے کائنات کی ہر شئے کے صحتمند ارتقاء کی ضمانت ہوتی ہے۔ لا الٰہ کا یہ تصوّر کائنات کی گردش کا مرکزی نقطہ اور اُس کے مقاصد کا منتہا ہے۔ اسی سے آفتاب کو نور اور ستاروں کو خرامِ ناز حاصل ہوتا ہے۔ اسی کی چمک سے موج بیقرار رہتی ہے اور سمندر کی تہہ میں گوہر کی تخلیق اسی کی رہینِ منّت ہے۔ اسی کے اثر سے مٹی پھول میں تبدیل ہوتی ہے مُٹھی بھر پَر اسی کے سوز سے بلبل کی صورت اختیار کرتے ہیں۔

نقطۂ ادوارِ عالم لا الٰہ ۔۔۔ انتہائے کارِ عالم لا الٰہ
چرخ را از زورِ او گردندگی ۔۔۔ مہر را پائندگی رخشندگی

بحر گوہر آفرید از تابِ او　　موج در دریا تپید از تابِ او

خاک از موجِ نسیمش گُل شود

مشتِ پر از سوزِ او بلبل شود

تکبیر میں مسلمان کے وجود کا راز پنہاں ہے۔ اِس لئے جب تک کہ تمام عالم میں بانگِ حق بلند نہ ہو مسلمان کو لمحہ کے لئے بھی چین نہیں آنا چاہیئے۔ قرآن نے مسلمانوں کو اُمتِ عادل کا خطاب دیا ہے۔ جس کی وجہ سے اُن کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے۔ لہٰذا اُن کا فرض ہے کہ اہلِ جہاں کو دعوتِ فکر دیں، پیغمبرِ عربی کی تعلیم اُن تک پہنچائیں اور اپنے مقصد کی تکمیل میں مصروف ہو جائیں تاکہ اِن پر رازِ کائنات کا افشا اور اسرارِ حیات کا انکشاف ہو سکے۔۔۔!

زانکہ در تکبیر راز بودِ تست　　حفظ و نشرِ لا الٰہ مقصودِ تست

تا نہ خیزد بانگِ حق از عالمے　　گر مسلمانی نیاسائی دمے

می نہ دانی آیۂ امّ الکتاب　　اُمتِ عادل ترا آمد خطاب

نکتہ سنجاں را صلائے عام دہ　　از علومِ اُمیّیء پیغام دہ

تا بدست آورد نبضِ کائنات

وا نمودِ اسرارِ تقویمِ حیات

مسلمانوں کے سامنے یہ اعلیٰ ترین آئیڈیل اس لئے بھی رکھا گیا ہے کہ فکرِ انسانی ہمیشہ وسوسوں کی پرورش اور نت نئے بتوں کی تخلیق کرتی ہے جس کے باعث انسانیّت کو پیہم صدمے پہنچتے رہتے ہیں۔ اِس کا انسداد تیغِ لا الٰہ ہی سے ہو سکتا ہے اور تمام خرابیوں کا ازالہ عقیدۂ توحید ہی کی شمشیر سے ممکن ہے۔

فکرِ انساں بُت پرستے بُت گرے — ہر زماں در جستجوئے پیکرے

باز طرحِ آذری انداخت است — تازہ تر پروردگارے ساخت است

بر سرِ ایں باطلِ حق پیرہن

تیغِ لَا مَوجُود اِلَّا ھُو بزن

تسخیرِ فطرت

شخصیّت کے ارتقا کے لئے فطرت کی قوتوں پر تصرف حاصل کرنا ضروری ہے۔ اِس غرض کی تکمیل سائنس کے ذریعے ہو سکتی ہے جو انسان کو بصیرت اور عقل کو پختگی فراہم کرتی ہے۔ تسخیرِ فطرت جہاں فرد کے لئے ضروری ہے وہاں قوم کے لئے موت وحیات کا مسئلہ بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے رموزِ فطرت پر غور فکر کی انسان کو بار بار دعوت دی ہے اور اس خصوص میں ترکِ جہد کو ملّتوں کی موت کا سبب قرار دیا ہے۔

اِنَّ فِی اختلاف الیل والنہار وما خلق اللہ فی السمٰوٰت والارض لاٰیٰت لقوم یتقون ـــ یعنی البتّہ دن اور رات کے بدلنے میں اور جو کچھ پیدا کیا ہے اللہ نے آسمانوں اور زمین میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو ڈرتے ہیں۔

اِن فی السمٰوٰت والارض لاٰیٰت للمومنین ـــ یعنی بیشک آسمان اور زمین میں مومنوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

وکم من ایۃٍ من السمٰوٰت والارض یمرون علیہا وھم عنہا معرضون ـــ یعنی زمین اور آسمان میں قدرت کی کتنی نشانیاں ہیں جن سے وہ

یونہی منہ پھیر کر گزر جاتے ہیں۔

قرآنِ مجید نے انسانی عظمت و شرف کی بنیاد حقیقتِ اشیاء کے علم کو قرار دیا ہے۔ فرمایا ہے کہ

وعلّم آدم الاسماء کلھا ـــــ اور سکھاوے آدم کو نام (خواص) سب چیزوں کے۔ یعنی

علمِ اسما اعتبارِ آدم است
حکمتِ اشیاء حصارِ آدم است

گویا حقیقی زندگی تسخیرِ فطرت کی بدولت نصیب ہوتی ہے۔ انسان اپنے علم کے ذریعے کائنات کی چھپی ہوئی دولت کو برآمد کر سکتا ہے۔ وہ حرارت، نور اور قوّت کے سرچشموں پر تصرّف حاصل کر کے مادہ کے تمام ممکنات پر قابو پا سکتا ہے ـــــ اور اس طرح وہ اُس مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں تمام آفاق اُس کے زیرِ فرماں آجاتا ہے ـــــ!

"تا ز تسخیرِ قوائے ایں نظام | ذو فنونِ نہائے تو گردد تمام
نائبِ حق در جہاں آدم شود | بر عناصر حکمِ او محکم شود

قرآنی تعلیم کے زیرِ اثر اسلامی حکماء نے مظاہرِ فطرت کے متعلق غور و فکر پر زور دیا اور استقرائی طریقِ تحقیق کو ترقی دے کر حقیقتِ اشیاء کی دریافت شروع کی۔ اِس طرح اُنہوں نے افلاطونی نظامِ تصوّرات کو چھوڑ کر جدید سائنس کی بنیاد رکھی۔ ـــ یونانی فلسفہ نے دُنیا کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔ لیکن اِن حکماء نے اس فلسفہ کے زہریلے اثرات کو حیاتِ اجتماعی سے خارج کر کے اسلامی تعلیم کے

مطابق عناصرِ فطرت کی تسخیر کا ذوق پیدا کیا۔ انہی کی بصیرت سے یورپ نے فیض حاصل کیا اور قرطبہ واندلس کی جامعات نے انہی کے علم و دانش سے اکتساب نور کیا۔ اہلِ یورپ ان جامعات سے مستفید ہوئے ان کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوگئیں۔ ان کے ذہن میں انقلاب برپا ہوگیا۔ اور اس طرح جدید یورپی تہذیب وتمدّن کی بنیاد رکھدی گئی ــــ مؤرخین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ بفالٹ کہتا ہے کہ:۔

"عصرِ جدید کے لئے سائنس عربوں کا بیش بہا تحفہ ہے"

اسی ذوق کی بدولت مسلمانوں میں بڑے بڑے حکیم اور سائنسداں پیدا ہوتے جارہے تھے کہ تصوّف کا ایک غلط تصوّر عربوں کے دماغ پر مسلط ہونے لگا اور وہ اس کی رو میں ایسے بہے کہ سائنس کی دنیا میں اُن کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا۔ ڈاکٹر سچا (Dr. Sachau) کہتا ہے کہ:۔

"اگر العشری اور الغزالی پیدا نہ ہوتے تو عرب گیلیلیوں اور نیوٹنوں کی ایک قوم ہوتی"

اس المناک صورتِ حال سے اقبال بہت متاثر ہوئے اور ذوقِ تسخیرِ فطرت کی از سرِ نو تخلیق کی کوشش کرنے لگے۔ اُنھوں نے بتایا کہ کائنات کی قوتوں پر اثباتِ خودی سے تصرّف حاصل ہوتا ہے اور اسی کی بدولت ایک ذرّہ سے عالمِ نو کی تعمیر ممکن ہوجاتی ہے۔ تمام مظاہرِ فطرت اہلِ نظر کے سامنے اپنے دامن کو پھیلا دیتے ہیں اور اُن کے تجسّس کے لئے تختۂ مشق بن جاتے ہیں ــــ!

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ عالمے از ذرّہٖ تعمیر کرد
کوہ و صحرا و دشت و دریا بحر و بر ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ تختۂ تعلیمِ اربابِ نظر

کائنات کا ہر مظہر انسان کی فکر کو مہمیز لگاتا ہے اور تحقیق و تجسّس کی اُسے دعوت دیتا رہتا ہے۔ لیکن انسان عام طور پر اپنی قوت سے لا علم اور اپنی صلاحیتوں سے بے بہرہ ہوتا ہے ـــــ اگر وہ اپنی حقیقت کو محسوس کرے تو وہ پہاڑوں کو تحلیل کر سکتا ہے، دریاؤں سے گوہر کی جوئے آب نکال سکتا ہے، فضائے بسیط میں سینکڑوں دنیاؤں کی دریافت اور ذرّوں کے اندر بے شمار آفتابوں کا انکشاف کر سکتا ہے ـــــ!

دست رنگیں کن زخونِ کوہسار جوئے آبِ گوہر از دریا بر آر،
صد جہاں در یک فضا پوشیدہ اند مہر ہا در ذرّہ ہا پوشیدہ اند

ضرورت تجسّس، تدبّر اور بلند حوصلگی کی ہے۔ آفاق کو مسخر کرنے کے لئے عزم کی ضرورت ہے۔ نگاہِ تیز اشیاء کی حقیقت تک پہنچ سکتی ہے اور حرارت و بجلی پر تصرّف حاصل کر کے انھیں اپنی کنیز اور خادم بنا سکتی ہے ـــــ!

جستجو را محکم از تدبیر کن، انفس و آفاق را تسخیر کن
چشمِ خود بکشا و در اشیا نگر نشّہ زیرِ پردۂ صہبا نگر،

آنکہ بر اشیا کمند انداخت است
مرکب از برق و حرارت ساخت است

ضبطِ روایات کوئی فرد اثباتِ خودی کے بغیر معرکۂ حیات میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح کوئی قوم اجتماعی خودی کے احساس کی تخلیق کے بغیر معراجِ کمال کو نہیں پہنچ سکتی۔ اس اجتماعی خودی کا ارتقا ضبطِ روایات کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ خوشحالی اور کامرانی کے دور میں ہر قوم اعلیٰ اور صحتمند روایات کو

جنم دیتی ہے جن کا وجود مصیبت اور تباہی کے ایام میں اُس کے لئے زندگی کا سہارا بن جاتا ہے۔ روایات کی اہمیت کا اندازہ یہودیوں کی تاریخ سے ہو سکتا ہے۔ اس چھوٹی سی قوم کو ہر جگہ پریشان کیا گیا اور ایسے مظالم ڈھائے گئے کہ اُس کے زندہ رہنے کے امکانات بھی نظر سے اوجھل ہونے لگے — لیکن ان تمام آزمائشوں میں وہ اِس لئے کامیاب رہی کہ اُس نے اپنی قدیم روایات کے دامن کو اپنے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔

کسی نے کہا ہے کہ

گذشتہ خواب و آئندہ خیال است
غنیمت داں ہمیں دم را کہ حال است

یعنی ماضی ایک خواب اور مستقبل ایک خیال ہے۔ اِس لئے صرف اسی زندگی کو غنیمت سمجھنا چاہیئے جو کہ موجود لمحہ سے گذر رہی ہے — یہہ تخیّل درحقیقت بہت بڑا فریب نظر ہے۔ اِس کو عُریانی میں دیکھیئے تو اِس میں شکست خوردہ ذہن اور زندگی سے فرار کی کیفیّت صاف نظر آسکتی ہے۔ قرآن نے تاریخ کو ایامِ الٰہی سے تعبیر کیا ہے جو نہ صرف درسِ عبرت اور پیام مسرّت ہے بلکہ تمام علوم کا ماخذ اور حوصلہ مندیوں کا منبع بھی ہے۔ اِس سے قوموں کے عروج و زوال کے اسباب سامنے آتے ہیں اور اُن کے افعال کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ بھی ممکن ہوتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ تاریخ کوئی قصّہ یا افسانہ نہیں ہے، بلکہ اس سے احساسِ ذات پیدا ہوتا ہے، انسان کی بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے اور اسی سے قوموں کی روح کو تابناکی اور جسم کو تقویت نصیب ہوتی ہے —!

چیست تاریخ اے ز خود بیگانہ، داستانے قصۂ افسانہ،
ایں ترا از خویشتن آگہ کند آشنائے کار و مردِ رہ کند
روح را سرمایۂ تاب است ایں جسمِ ملّت را چو اعصاب است ایں

حقیقت کے اندر ماضی اور مستقبل ساتھ ساتھ موجود رہتے ہیں۔ تاریخ ان کے وجود پر روشنی ڈالتی ہے اور اس طرح حقیقت شناس قوموں کی ترقی کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ وہ گذشتہ اقدارِ حیات کی تجدید کرتی ہے اور واقعات کے چہرے سے ماضی کے نقاب کو اٹھا کر ایک روشن شکل میں انھیں ہمارے سامنے لے آتی ہے۔

شمعِ او بختِ امم را کوکب است روشن از وے امشب و ہم دیشب است
چشمِ پُر کارے کہ بیند رفتہ را پیشِ تو باز آفریند رفتہ را

جس طرح فرد روح اور جسم کے ربط سے زندہ رہتا ہے اور قوم اپنی قدیم عظمت کے تحفّظ کی بدولت قائم رہتی ہے۔

زندہ فرد از ارتباطِ جان و تن زندہ قوم از حفظِ ناموسِ کہن

اُسی طرح اپنی تاریخ کے تحفظ سے ہم دُنیا میں سرخرو رہتے ہیں۔ اور روایات کی یاد ہماری خودی کو زندہ اور برقرار رکھتی ہے۔ لیکن جو قوم اپنی روایات کو فراموش کر دیتی ہے وہ اپنے اجتماعی وجود کی تباہی و بربادی کے اسباب خود فراہم کر لیتی ہے۔

قوم روشن از سوادِ سرگذشت خود شناس آمد ز یادِ سرگذشت
سرگذشتِ او گر از یادش رود باز اندر نیستی گم می شود،

اموميت مسئلہ اموت دنیا کے ہر ادب میں اہمیت حاصل کر رہا ہے۔ اقبال کے

نزدیک کسی قوم کی اصل دولت ہیرے جواہرات، سونا اور چاندی نہیں ہوتی بلکہ صحتمند، محنتی اور ذہین افراد ہی اُس کا سرمایہ حیات ہوتے ہیں۔

قوم را سرمایہ اے صاحب نظر　　نیست از نقد و قماش و سیم و زر
مالِ او فرزند ہائے تندرست　　تر دماغ و سخت کوش و چاق و چست

آرتھر ہیربنٹ کہتا ہے کہ:۔

"انگلستان پھر یہہ سبق حاصل کر رہا ہے کہ آرام و آسائش یا دولت و اقتدار بجائے خود کوئی نصب العین نہیں ہیں بلکہ کسی قوم کا بہترین سرمایہ اُس کے فرزندوں اور فرزندوں کے فرزندوں کے اوصاف میں مضمر ہوتا ہے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ امومت کی عزت اور حفاظت ہر ذی شعور ملّت پر لازم ہے۔ مغربی ممالک جو کل تک ضبطِ تولید کے قائل تھے آج اِس حقیقت کو محسوس کر رہے ہیں اور ان عورتوں کو تعظیم و تکریم، بخشش و انعام کی مستحق قرار دے رہے ہیں جن کے بچّے نہ صرف قوی اور صحتمند ہوں بلکہ تعداد میں بھی زیادہ ہوں۔ ہیلین جیکسن کہتا ہے کہ:۔

"وہ عورت جو ایک گھر کو آباد کرتی ہے اور جس کی نگرانی میں بچّے بڑے ہو کر قوی اور نیک مرد اور عورتیں بن جاتے ہیں خدا کے بعد سب سے بڑی خالق ہے۔"

اقبال کے خیال میں بھی امومت نوع انسانی کیلئے باعثِ رحمت ہے کیونکہ اُس کو نبوّت سے نسبت ہے۔ اچھی امومت سے قوم کی عمارت پائیدار اور

مستقبل روشن ہوتا ہے۔ اُسی سے رفتارِ حیات میں تیزی پیدا ہوتی ہے، زندگی کے دھارے میں دبی متوج کا سبب بنتی ہے اور اُسی سے اسرارِ حیات کا انکشاف ہوتا ہے۔

نیک اگر بینی اُمومت رحمت است ۔۔۔ زانکہ او را با نبوت نسبت است

از امومت پختہ تر تعمیرِ ما ۔۔۔ در خطِ سیمائے او تقدیرِ ما

از امومت گرم رفتارِ حیات ۔۔۔ از امومت کشفِ اسرارِ حیات

از امومت پیچ و تاب جوئے ما

موج و گرداب و حبابِ جوئے ما

اِس طرح امومت کی اہمیت کا اندازہ کر کے اقبال اس کے استحکام کی ضرورت کو واضح کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ :-

"مجموعی حیثیت سے اگر نوع پر نظر ڈالی جائے تو اِس کے وہ افراد جو ابھی پیدا نہیں ہوئے اس کے موجودہ افراد کے مقابلہ میں شاید زیادہ بدیہی الوجود ہیں۔ موجودہ افراد کی فوری اغراض ان غیر موجود، نامشہود افراد کی اغراض کی تابع بلکہ ان پر قربان کر دی جاتی ہیں جو نسلاً بعد نسلٍ رفتہ رفتہ ظاہر ہوتے ہیں۔ ملتوں کیلئے سب سے زیادہ اہم مسئلہ یہہ ہے کہ اجتماعی وجود کا تمدنی، اقتصادی یا سیاسی سلسلہ بلا انقطاع کس طرح قائم رکھا جائے۔ فنا اور معدوم ہوجانے کے خیال سے ملتیں بھی اُسی طرح خوفزدہ ہو جاتی ہیں جس طرح کہ افراد۔ کسی قوم کی مختلف عقلی یا غیر عقلی صلاحیتوں کے محاسن کا اندازہ ہمیشہ اسی مقصد سے کیا جانا چاہیئے"۔

اس تمام گفتگو سے ظاہر ہے کہ اقبال شعورِ ذات اور حریت کے حامی ضرور ہیں لیکن دیگر انفرادیت پسندوں کے برعکس وہ انفرادی خودی کی پرورش اور اجتماعی نظم و ضبط میں ایک خوشگوار امتزاج پیدا کرنا چاہتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر فرد کی صلاحیتوں کا اُجاگر ہونا ممکن نہیں ہے۔ انتہائی انفرادیت پسندی اپنے اصل روپ میں نراج کی ایک شکل ہے۔ نٹشے کا فلسفۂ خودی جو اجتماعی اخلاق کا مضحکہ اڑاتا ہے، نراج ہی کا علمبردار ہے۔ اسی انفرادیت پسندی نے قرونِ وسطیٰ کے اداروں کے کھنڈرات پر جدید سرمایہ داری کی تعمیر کی اور جماعت کو فرد کا تابع قرار دیکر حصولِ دولت کی ہر جائز و ناجائز راہ فرد پر کھول دی۔ لیکن جس شدّت سے سرمایہ داری اُبھرتی گئی اُسی شدّت سے اُس کا ردِّعمل بھی شروع ہوا اور ہمہ گیر مملکتیں (Totalitarian States) معرضِ وجود میں آئیں۔ جنھوں نے انفرادی خودی کو نظر انداز کر کے جماعت کو ہر شعبۂ زندگی پر حاوی کر دیا ہے —— موجودہ مغربی تمدّن ان ہی دو اصولوں کا میدانِ کارزار بنا ہوا ہے۔!

اقبال کا فلسفۂ بیخودی ایسی صالح جماعتی زندگی کا تصور پیش کرتا ہے جس میں فرد رضاکارانہ طور پر جماعتی مفادات کے لئے اپنی خدمات وقف کر دیتا ہے ایسے معاشرہ کا ہر فرد یہہ محسوس کرتا ہے کہ جماعت کی مادی اور اخلاقی تکمیل کے بغیر اُس کی اپنی زندگی کامیاب نہیں ہو سکتی اور نہ اُس کی فطری صلاحیتوں کو اُبھرنے کا کوئی موقع مل سکتا ہے —— اِس طرح انفرادی حریّت اور جماعتی آئین کا ظاہری تضاد رفع ہوتا ہے۔ افراد کے لئے مشترک اساس قائم ہوتی ہے۔ اُن میں روحانی تعلق اور جذباتی ربط پیدا ہوتا ہے۔ یہی جماعتی انا

ماضی کی محافظ، مستقبل کی آئینہ دار اور ملّت کی بقا کی بہترین ضمانت ہو جاتی ہے۔

مایہ دارِ سیرتِ دیرینہ او
رفتہ و آئندہ را آئینہ او

وصلِ استقبال و ماضی ذاتِ او
چوں ابد لا انتہا اوقاتِ او

اقبالؒ کا تصوّرِ عشق

عشق با نانِ جوین خیبر گشاد　　عشق در اندامِ مہ چاکے نہاد!

عشق در جان چون بچشم اندر نظر　　ہم درونِ خانہ ہم بیرونِ در

عشق ہم خاکستر و ہم اخگر است　　کارِ او از دین و دانش برتر است

عشق سلطان است و برہانِ مبین　　ہر دو عالم عشق را زیرِ نگین

تو خورشیدی و من سیارهٔ تو   سراپا نورم از نظّارهٔ تو
ز آغوشِ تو دورم ناتمامم   تو قرآنی و من سیپارهٔ تو

زماں کی قیود سے وہ (عشق) بالاتر اور مکاں کی حدود سے
بے نیاز ہوتا ہے۔ اُسی سے زندگی میں رونق ہے اور وہی
گرمیٔ حیات کا موجب ہوتا ہے۔ پہاڑ اُس کی ہیبت سے
لرزہ بر اندام ہوتے ہیں، بلندیوں کو وہ مغلوب اور موت
پر فتح حاصل کرتا جاتا ہے —!

اقبالؔ کا تصورِ عشق

عام طور پر محبت کو مرد اور عورت کی باہمی کشش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن اقبال کے نزدیک محبت اس سے زیادہ قیمتی اور ہمہ گیر جوہر ہے "عشق"، کی اصلاح کو وہ نہایت وسیع معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عشق زندگی کے جمالیاتی پہلوؤں کا صرف مطالعہ ہی نہیں بلکہ زندگی کی مشکلات پر قابو حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ بھی ہے۔ لہٰذا انسان کا وہ پاکیزہ اور طاقتور جذبہ جو اُس کے کردار کو بلند سے بلند تر کر دے، جو ذہنی اور طبعی موانعات و مشکلات کے باوجود اُس کو لطیف اور اعلیٰ مقاصد کی طرف ڈھکیلے، اقبال کے نزدیک "عشق"، کی تعریف میں داخل ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ :۔

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

اُن کے خیال میں عشق کا دائرہ عمل نہایت وسیع ہے۔ محفلوں کی رنگینی، پہاڑوں کی تنہائی، واعظ کی شعلہ نوائی اور مجاہد کی سرفروشی —— یہہ سب عشق ہی کی شکلیں ہیں ——!

کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق، کبھی سوز و سرور و انجمن عشق
کبھی سرمایۂ محراب و منبر کبھی مولا علیؓ خیبر شکن عشق

وہ کہتے ہیں کہ جذبۂ عشق مادی وسائل اور مادی قدروں سے بے نیاز ہوتا ہے۔ فقیری اور بادشاہی میں اُس کے نزدیک کوئی فرق نہیں ہوتا اور معرکۂ حق و باطل میں کبھی وہ مسلّح ہو کر پہنچ جاتا ہے تو کبھی بے تیغ و سناں لڑنے لگتا ہے۔!

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق کبھی شاہِ شہاں نوشیرواں عشق
کبھی میدان میں آتا ہے زرہ پوش کبھی عریاں و بے تیغ و سناں عشق

اس سے ظاہر ہے کہ لیلیٰ و مجنوں کی محبت، شیریں و فرہاد کی اُلفت اور انسانی سماج میں مرد و عورت کی محبت کے روزمرّہ حادثات عشق کی تعریف میں شامل تو ہو سکتے ہیں، لیکن جذبۂ عشق کی وسعت صرف یہیں تک محدود نہیں ہے، بلکہ اِس منزل سے گزر کر جب آپ اور آگے بڑھتے ہیں تو آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ اِس کی قوت بھی بے پایاں اور غیر محدود ہے۔ کہتے ہیں کہ

تیشہ اگر بہ سنگ زد ایں چہ مقامِ گفتگو است
عشق بدوش می کشد ایں ہمہ کہسار را،

یعنی اگر فرہاد نے شیریں کی خاطر تیشہ کے ذریعے پہاڑ کاٹ کر نہر نکالنی چاہی تو اِس میں تعجّب کی بات ہی کیا ہے، اس میں فرہاد کا کمال ہی کیا ہے۔ عشق میں تو وہ قوّت ہوتی ہے کہ تیشہ کے چلانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی، بلکہ جو سچے عاشق ہوتے ہیں وہ ایسے پہاڑوں اور کوہساروں کو اپنے دوش پر اُٹھائے پھرتے ہیں —!

اقبال مقاصد کی لگن کو "عشق" سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کے تصور کے مطابق اس کی روح انسانی طبیعت میں شامل ہے۔ اِس کا ولولہ انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ یہ ایک حرکت پذیر جذبہ، ایک اضطراب انگیز ذوقِ وجدان ہے جو کائنات کے عناصر میں جذب بھی ہوتا ہے اور انھیں مفتوح اور مسخر بھی کر لیتا ہے اور اس طرح کائنات میں تخلیق اور افزائش کے مسلسل عمل کا سبب بن جاتا ہے۔ وہ ہر قسم کی موانعات اور مشکلات پر چھا ہے وہ فطری اور قدرتی ہوں یا انسان وسماج کی پیدا کردہ ہوں، غالب آجاتا ہے۔ زماں کی قیود سے وہ بالاتر اور مکان کی حدود سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اُسی سے زندگی میں رونق ہے اور وہی گرمیِ حیات کا موجب ہوتا ہے۔!

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ ۔۔۔ عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو ۔۔۔ عشق خود اِک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا ۔۔۔ اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفےٰ ۔۔۔ عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گُل تابناک ۔۔۔ عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

محبت کے افسانے اور دل کی وارداتیں انسان کی طرح قدیم ہیں۔ ان کا سلسلہ جب سے کہ نوعِ انسان کی تخلیق ہوئی ہے برابر چلا آتا ہے، اور آئینِ فطرت کے مطابق یقین ہے کہ تا ابد جاری رہیگا۔ لیکن اس کی نوعیت کے بارے میں مفکرین نے اپنی اپنی سمت کے مطابق خیال آرائی کی ہے۔ ہیولاک ایلس محبت کو محض

جنسی خواہش سمجھنا ہے، خواہ یہہ محبّت ماں کو اپنے بیٹے سے، بیٹی کو اپنے باپ سے یا کسی مردِ کامل کو اپنے اعلیٰ ترین مقاصد ہی سے کیوں نہ ہو — اس سلسلہ میں عام فلمی اشعار کو لیجیے، جو عشق، کو ایک نہایت یاس انگیز رنگ میں پیش کر کے انسانی حوصلوں کو لسپت تر کر دیتے ہیں۔ یہہ اشعار دن رات گلی کوچوں میں سنائی دیتے ہیں اور بدبختی سے ہماری نسل کی گھٹی میں ڈالدیئے جا رہے ہیں۔ دراصل یہ نکتہ زندگی سے اُس کی تابناکی چھین لیتی ہے اور انسانی رفعت اور بلندی کے عین مغائر ہے۔ اور اِس اعتبار سے قوم و ملک کے لئے زہرِ ہلاہل سے کم نہیں ہے۔ لیکن کچھ اِسی پر منحصر نہیں، بعض سنجیدہ لوگوں نے بھی اس بارے میں بڑی غلطی کی ہے، اور یاس وحزن وملال کی رو میں خود بھی بہہ گئے ہیں اور اپنے پڑھنے اور سننے والوں کو بھی بڑی حد تک بہائے جانے کے باعث ہوتے ہیں — مثلاً میرؔ کہتے ہیں کہ۔

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
آخر اِس بیماریِٔ دل نے اپنا کام تمام کیا

یعنی ان کے نزدیک محبّت دل کی ایک بیماری ہے جس پر کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی بلکہ وہ انسانی وجود کو بالآخر فنا کے گھاٹ اُتار دیتی ہے۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ غالبؔ کا سا روشن ضمیر شاعر بھی جس کے نزدیک عشق زندگی کی اصلیت ہے اور جو کہتا ہے کہ

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی ، درد لادوا پایا ،،

بعض جگہ راستہ بھول جاتا ہے اور یہہ کہنے لگتا ہے کہ

عشق بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس

اور عشق نے غالبؔ نکما کر دیا

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

یعنی محبّت اجزائے حواس کے شیرازہ کے منتشر ہونے کا نتیجہ ہے اور عشق ایک ایسی بُری بلا ہے کہ جو انسان سے اُس کی صلاحیتیں چھین لیتی ہے اور اُس کے دستِ بازو کو شل کر کے اُس کی زندگی کو نکمّا اور بیکار کر دیتی ہے — یہ طریقۂ فکر اساسی اور بنیادی طور پر غلط اور حقیقت کے منافی ہے اور اِسی کے خلاف اقبال نے پوری طاقت اور ساری توانائی کے ساتھ جہاد کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

دانش و دین و علم و فن بندگیِ ہوس تمام　　عشق گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی

جوہرِ بندگی ہے عشق، جوہرِ عشق ہے خودی　　آہ کہ ہے یہہ تیغِ تیز پردگیِ نیام ابھی

ابن سینا نے عشق کے متعلق نہایت صحتمند نظریہ قائم کیا ہے اُس کے نزدیک تمام کائنات میں عشق ہی کے سبب سے ربط و نظم قائم ہے اور یہی جذبہ جب انسان کے دِل میں جلوہ افروز ہوتا ہے تو اُسے حیاتِ سرمد بخشد یتا ہے — رومیؔ عشق کو تمام بیماریوں کا علاج سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عشق کی بدولت انسان فطرت کو مغلوب کر کے تمام مادی قدروں سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما　　اے طبیبِ جملہ علّت ہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموسِ ما　　اے تو افلاطون و جالینوسِ ما

جسمِ خاک از عشق بر افلاک شد　　کوہ در رقص آمد و چالاک شد

رومی اور اقبال دونوں کا خیال ہے کہ محبت ایک جذبہ ہے جس کے تحت انسان اپنے معشوق کی خوبیوں اور صفات کو اپنے اندر جذب کرنا چاہتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس انجذابی خصوصیت سے خودی کے استحکام میں مدد ملتی ہے۔ یہ ایک عجیب کیفیت ہے جس میں عاشق کچھ دیتا ہے تو کچھ لیتا بھی ہے اور مرتا ہے تو زندگی بھی حاصل کرتا ہے۔ رومی کہتے ہیں کہ اسی عمل انجذاب کے تحت عمل ارتقاء جاری رہتا ہے۔ جمادات نباتات کا جزو بن جاتے ہیں۔ نباتات ترقی کرتے ہیں تو حیوانات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، حیوانات انسان کے درجے کو پہنچتے ہیں اور انسان خدا کی صفات حاصل کر کے خودی مطلق سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

از جمادی مُردم و نامی شدم — وز نما مُردم بحیواں سر زدم

مُردم از حیوانی و آدم شدم — پس چہ ترسم کے ز مُردن کم شدم

حملۂ دیگر بمیرم از بشر — تا بر آرم از ملائک بال و پر

وز ملک ہم بایدم جُستن ز جو — کُل شَیْءٍ ھالِکٌ اِلّا وَجْھَہٗ

بار دیگر از ملک قرباں شوم — آنچہ اندر وہم نا ید آں شوم

پس عدم گردم عدم چوں ارغنوں

گویدم کانّا الیہِ راجعون

انسانی شعور نے روح کی بلندیوں کو غیر محدود کر دیا ہے۔ انسان میں موت کے بعد بھی بقا کی تمنا موجود رہتی ہے۔ یعنی انسانی خودی میں غیر فانی اور غیر متغیر کے ساتھ وابستگی کا جو عشق موجود ہے وہ انسان کو لازوال بنا دیتا ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ اگر موت کی وجہ سے ایک دنیا نظر سے غائب ہو جائے تو

اِس کی کیا پرواہ ہے، کیونکہ انسان کے ضمیر کے اندر موت کے بعد بھی بے شمار عالم موجود رہتے ہیں ——!

دلِ من رازدانِ جسم وجان است — نہ پنداری اجل برمن گراں است
چہ غم گر یک جہاں گم شد ز چشمم — ہنوز اندر ضمیرم صد جہاں است،

اُن کے نزدیک موت انسانی ارتقاء میں صرف ایک منزل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اِسی وجہ سے مردِ کامل اُس پر اس طرح جھپٹتا ہے جس طرح کہ شاہین کبوتر پر حملہ آور ہوتا ہے ——!

بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ — یک مقام از صد مقامِ اوست مرگ
می فتد بر مرگ آں مردِ تمام — مثلِ شاہینے کہ اُفتد بر حمام

اقبال کے تصوّر کے مطابق عشق زندگی کا قوی ترین محرّک ہے اور فطرت کی بزمِ خموشاں میں اِسی کے وجود سے ساری رونق ہے۔ غالباً نظیری نے کہا ہے کہ

سلطانِ ازل گنجِ غمِ عشق بما داد — مارُوئے دریں منزلِ ویرانہ نہادیم

اقبال نے بھی اسی تاثر کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے کہ

عشق از فریادِ ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد
ورنہ ایں بزمِ خموشاں ہیچ غوغائے نداشت

عشق مادی وسائل سے بے نیاز ہوتا ہے۔ یہہ عشق ہی کا زور تھا کہ حضرت علیؓ نے جنہیں نانِ جویں بھی مشکل سے فراہم ہوتی تھی درِ خیبر کو ایک ہی ضرب میں اکھیڑ دیا تھا اور یہہ عشق ہی کا کرشمہ تھا کہ محمدؐ عربی نے ایک اشارے سے مہتاب کے

دو ٹکڑے کر دیئے تھے!

زورِ عشق از باد و خاک و آب نیست ۔۔۔ قوتش از سختیِ اعصاب نیست
عشق با نانِ جویں خیبر کشاد ۔۔۔ عشق در اندامِ مہ چاکے نہاد!

وہ کہتے ہیں کہ عشق کی تخلیق سے پہلے ساری کائنات بے نور اور بے جان تھی حرکت کا کوئی تصوّر موجود نہیں تھا۔ آسماں کے ستارے لذتِ گردش سے ناآشنا تھے۔ قمر کے وجود میں کوئی دلکشی نہیں تھی، عروسِ شب کی زلفیں پیچ و خم سے آراستہ نہیں تھیں اور فضاؤں میں کیف اور ہواؤں میں مستی نہیں تھی۔ یعنی اشیاء کی تخلیق تو ہو چکی تھی لیکن عالم کون و فساد میں ربط و نظم قائم نہیں ہو سکا تھا۔! اقبال نے اپنی نظم میں جس کا عنوان "محبت" ہے اسی کیفیت کو نہایت دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں

عروسِ شب کی زلفیں تھیں ابھی ناآشنا خم سے
ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذتِ رم سے
قمر اپنے لباسِ نو میں بیگانہ سا لگتا تھا
نہ تھا واقف ابھی گردش کے آئینِ مسلّم سے
ابھی امکاں کے ظلمت خانے سے ابھری ہی تھی دنیا
مذاقِ زندگی پوشیدہ تھا پہنائے عالم سے
کمالِ نظمِ ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا
ہویدا تھی نگینے کی تمنّا چشمِ خاتم سے

یعنی اس وقت کائنات کی نامکمّل حالت تھی اور اس میں کسی چیز کی کمی

محسوس ہوتی تھی۔ جس طرح کوئی انسانی جسم بغیر روح کے ڈراؤنا نظر آتا ہے، کوئی دریا بغیر پانی کے بھیانک معلوم ہوتا ہے اُسی طرح ایک انگوٹھی جس میں نگینہ نہ ہو بے کیف معلوم ہوتی ہے اور نگینہ کی تمنا اُس سے چھلکتی رہتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ کائنات کی بالکل ایسی ہی کیفیت تھی جبکہ عشق کا وجود نہیں تھا اور اُس کی کلفرمائیاں معدوم تھیں۔ پھر کہتے ہیں کہ

سنا ہے عالمِ بالا میں کوئی کیمیاگر تھا
صفا تھی جس کی خاکِ پا میں بڑھ کر ساغرِ جم سے
لکھا تھا عرش کے پائے پہ اک اکسیر کا نسخہ
چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشمِ روحِ آدم سے
نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیمیاگر کی
وہ اس نسخے کو بڑھ کر جانتا تھا اسمِ اعظم سے
بڑھا تسبیح خوانی کے بہانے عرش کی جانب
تمنائے دلی آخر بر آئی سعیِ پیہم سے
پھرایا فکرِ اجزا نے اسے میدانِ امکاں میں
چھپے گی کیا کوئی شئے بارگاہِ حق کے محرم سے

یعنی انسانی شخصیت جو کوئی کمی، کوئی تشنگی محسوس کر رہی تھی، اپنی کمی کو پورا کرنے اور اپنی تشنگی کو رفع کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے لئے اس کو ایک نسخہ کا پتہ چل گیا جو عرشِ اعظم کے پائے پر لکھا ہوا تھا اس نے یہ نسخہ وہاں سے کسی نہ کسی طرح حاصل کر ہی لیا۔ اِس نسخہ کے اجزاء بلاحظہ ہوں۔

چمک تارے سے مانگی، چاند سے داغِ جگر مانگا
اُڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلفِ برہم سے
تڑپ بجلی سے پائی حور سے پاکیزگی پائی،
حرارت لی نفس ہائے مسیحِ ابنِ مریم سے
ذرا سی پھر ربوبیّت سے شانِ بے نیازی لی
ملک سے عاجزی، افتادگی تقدیرِ شبنم سے
پھر ان اجزاء کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں
مرکّب نے محبت نام پایا عرشِ اعظم سے
مہوس نے یہہ پانی ہستئ نوخیز پر چھڑکا
گرہ کھولی ہنر نے اس کے گویا کارِ عالم سے
ہوئی جنبش عیاں، ذروں نے لطفِ خواب کو چھوڑا
گلے ملنے لگے اُٹھ اُٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے
خرامِ ناز پایا آفتابوں نے، ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی، داغ پائے لالہ زاروں نے

یعنی عشق کے اثر سے کائنات لذتِ خرام سے روشناس ہوئی، سکوت اور جمود زائل ہوگیا۔ ہر چیز متحرک ہوگئی گویا کہ اس میں جان پڑگئی۔ اس حرکت سے جوشِ حیات اور ذوقِ نمود کی تخلیق ہوئی۔ اور دنیا کی تمام رنگینیاں، دلچسپیاں اور ہنگامہ آرائیاں وجود میں آگئیں۔!

یہاں ایک بات جو توجہ کے لائق ہے وہ عشق اور

محبت کی پاکیزگی اور اس کی عظمت ہے۔ ہیولاک ایلس کے برعکس اقبال عشق کو ایک ایسا مقدس اور لطیف جذبہ سمجھتے ہیں جس کا نسخہ عرشِ اعظم کے پائے پر لکھا ہوا ہے اور اسی سبب سے وہ کہتے ہیں کہ عشق دُنیا کی چھوٹی چھوٹی قدروں سے بالاتر ہے۔ منزل کی راحت، جسمانی آرام و آسودگی اور سکونِ قلب سے بے نیاز ہے اور یہی اُسکی خصوصیت ہے۔ چنانچہ وہ مجنوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ۔

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلےٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اور عشق کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال، لذّتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام

عشق کی یہ صورت اس لئے ہے کہ وہ جذباتِ انسانی کا سرتاج ہے اور اگرچہ اس کا لازمی نتیجہ بیتابی اور اضطراب ہے تاہم دل کو اسی میں لطف آتا ہے چنانچہ اقبال کہتے اور جھوم جھوم کر کہتے ہیں کہ

ایں حرف نشاط آور می گویم و می رقصم
از عشق دل آسا ید باایں ہمہ بیتابی

اس کے برعکس ٹیگور کے عشق کو ملاحظہ کیجیے کہ اُس میں اضطرار نہیں ہے۔ وہاں سکون ہے، غنودگی اور خواب کی سی کیفیت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

"وہ آئے اور آکر میری بغل میں بیٹھ گئے — لیکن میں سوتا ہی رہا"

گویا ٹیگور کا عشق راحت اور سکونِ طلب سے بے نیاز نہیں ہے۔ یہ عاشق رہ نوردِ شوق نہیں ہے، عشرتِ منزل سے ناآشنا نہیں ہے شورشِ طوفاں کا پاسباں نہیں ہے ــــ! اور اسی وجہ سے وہ اپنے محبوب سے دور ہوتا ہے اور اُس کی صفات کو اپنے اندر جذب کرنے سے قاصر رہتا ہے۔

"میں تمہیں اپنا مالک بناتا ہوں۔ اس لئے تم سے دُور رہتا ہوں۔
میں تم میں اپنا پن نہیں دیکھتا ہوں۔ اس لئے تمہارے نزدیک
نہیں آتا ہوں۔"

یعنی ٹیگور کا عشق انجذاب کے جوہر سے محروم ہے جو رومیؔ اور اقبالؔ کے نزدیک خودی کے استحکام میں ممد و معاون اور کائنات کے عملِ ارتقا کا باعث ہوتا ہے ــــ!

جذب و مستی کو اقبال عقل پر فضیلت دیتے ہیں کیونکہ انسانی زندگی پر عقل اس قدر اثر انداز نہیں ہوتی جس قدر کہ عشق ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ

من بندۂ آزادم، عشق است امامِ من
عشق است امامِ من، عقل است غلامِ من

اُنہوں نے متعدد جگہ عقل کی مذمت بھی کی ہے ــــ لیکن قرآن تو غور و فکر کی قدم قدم پر دعوت دیتا ہے اور عقل و خرد ہی پر اپنی بصیرت کی بنیاد رکھتا ہے

اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ
یعنی ارض و سما کی تخلیق اور اختلافِ لیل و نہار میں عقلمندوں کے لئے آیات موجود ہیں

تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کے تصورِ عشق اور قرآنی بصیرت میں اِس تضاد کی کیا توجیہہ ہو سکتی ہے ؟ جبکہ اقبال خود یہہ کہتے ہیں کہ

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام
شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام،

اس کا جواب یہہ ہے کہ ہمیں عقل کے مقام اور فرائض کا تعین کرنا چاہیئے۔ قرآن کی رو سے کائنات ایک مقررّہ قانون کے تحت عمل کر رہی ہے، اور اسی قانون کے علم سے کائنات اور فطرت کی تسخیر ممکن ہے۔ لیکن اِس علم کے حصول اور اُس کے مطابق عمل کرنے کے لئے حسیّ مشاہدات اور عقل کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ چنانچہ تسخیرِ فطرت کے سلسلہ میں اقبال غور و فکر کو بڑی اہمیّت دیتے ہیں اور افلاطون پر اعتراض کرتے ہیں کہ اس نے حسیّ مشاہدات اور سمع و بصر کو حقیقی علم کے حصول کے ناقابلِ قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حقیقت اپنے مظاہر میں بستی ہے اور انسان صرف عقل ہی کے ذریعے محسوس دنیا کے مشاہدہ سے تسخیرِ فطرت کر سکتا ہے — لیکن اِس عالمِ محسوسات کے پیچھے ایک اور حقیقت ہے جس کا ادراک عقل کے لئے ناممکن ہے۔ کائنات کی ابتدا و انتہا کا علم اور خالقِ کائنات کی ماہیّت کا تعیّن عقل کے بس کے باہر ہے — تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ادراکِ حقیقت کی کیا صورت ہے؟ قرآن کے مطابق وحی اِس منصب کو انجام دیتی ہے اور اقبال کہتے ہیں کہ عقل صرف محسوسات کی دنیا تک محدود ہے۔ اُس سے آگے بڑھ نہیں سکتی۔!

عقل گو آستاں سے دور نہیں اُس کی تقدیر میں حضور نہیں

اور　　خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
تیرا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

کیونکہ اُن کے نزدیک عقل چراغ رہگذر ہے، جس کی روشنی میں مادی دنیا کے معاملات سلجھائے جاتے ہیں لیکن اس چراغ کو درونِ خانہ کی ہنگامہ آرائیوں کا کوئی علم نہیں ہو سکتا اور اندرونی مسائل کو حل کرنے کے لئے جذبۂ عشق ہی سے مدد لینی پڑتی ہے جو ہماری ساری جبلتوں کو سیراب کرتا رہتا ہے۔

خرد سے راہرو روشن بصر ہے　　خرد کیا ہے؟ چراغِ رہگذر ہے!
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا　　چراغِ رہگذر کو کیا خبر ہے؟

عہدِ جدید کے سائنسدانوں پر بھی اس امر کا انکشاف ہوتا جا رہا ہے کہ حقیقت کی ماہیت کے دریافت کرنے میں سائنس ناکام رہی ہے۔ ایڈنگٹن اپنی کتاب "طبعی دُنیا کی ماہیّت" میں لکھتا ہے کہ "سائنس کی تحقیقات اشیاء کی حقیقت کے متعلق ہمیں کچھ نہیں بتا سکتی"۔ اور عقل کے بارے میں جوڈ کہتا ہے کہ "انسان کی خرد اُس کے جذبات کے تابع اس طرح چلتی ہے جس طرح کتّے کے پاؤں اُس کی ناک کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں"۔ اسی سبب سے اقبال کہتے ہیں کہ انسانی عقل کو جو کہ افراد اپنی اغراض کے لئے استعمال کرتے ہیں اور جو دنیا کی تمام تباہیوں کا باعث ہو رہی ہے وحی کے تابع رکھنا چاہیئے۔

عقل خود بیں، غافل از بہبودِ غیر　　سودِ خود بیند، نہ بیند سودِ غیر!
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ　　در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ!

کانٹ نے عقل کے دائرۂ عمل کو بیرونی مظاہر تک محدود کر دیا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ تمام علم حواس ہی کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اُس نے یہ ثابت کیا کہ زندگی کے لطیف مسائل میں جن کا تعلق شعور و احساس سے ہے ذہنی کاوش ناکام ہوتی ہے اور اس لئے عقیدہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کے وجود اور ارادہ کی آزادی اور اسی نوع کے دیگر مسائل کو عقل کے ذریعے ثابت یا ناثابت نہیں کیا جا سکتا۔ شوپنہار نے عقل کے بت کو پارہ پارہ کر دیا اور نٹشے نے جذباتی اور جمالیاتی عناصر کو عقلیت پر فوقیت دی۔ اس کے نزدیک سائنس اور خالص ذہنی تعلیم بے معنی ہیں۔ اُسے شکایت ہے کہ اساتذہ نے تعلیم کو بے کیف اور بے روح کر دیا ہے کیونکہ محض معلومات کا فراہم کرنا تخلیق کیلئے ناکافی ہے جو اُسی وقت ممکن ہے جبکہ وجدان کو بیدار کیا جائے، انسان کو جوہرِ عشق عطا کیا جائے اور زندگی کو اُس کا سوزِ دروں بخشدیا جائے ———!

سقراط اور ارسطو عقل کے بڑے حامی ہیں۔ لیکن وہ بھی کہتے ہیں کہ اعلیٰ درجہ کی شاعری عقل کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ وجدان شعر کو کیف اور سوز عطا کرتا ہے ——— جذب اور تڑپ کا یہ تصور رومی، نٹشے اور اقبال میں مشترک ہے جو عقل کی گتھیوں اور خرد کی بھول بھلیوں سے نکلکر زندگی کی شاہراہ پر آنے کا راستہ محض عشق و محبت ہی کو سمجھتے ہیں۔ رومی فرماتے ہیں کہ عشق کے رموز کو عقل بیان نہیں کر سکتی۔ عقل اِس کوشش میں گدھے کی طرح کیچڑ میں پھنس کر بے بس ہو جاتی ہے۔ عشق کی تشریح عشق ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ آفتاب کے طلوع ہونے کا ثبوت آفتاب ہی دے سکتا ہے ———!

عقل در شرحش چو خر در گِل بخفت   شرحِ عشق و عاشقی ہم عشق گفت

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب   گر دلیلش خواہی رُو ازوے متاب

اور اسی وجہ سے اقبال بھی کہتے ہیں کہ

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں　　خداوندا مجھے صاحب جنوں کر

لیکن اقبال عقل کو بھی زندگی کے خادموں میں شمار کرتے ہیں اور زندگی پر اس کے احسانات کو تسلیم کرتے ہیں اُن کے خیال میں عقل اور عشق کے باہمی تعاون سے انسان زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکتا ہے اور ان کی کیمیاوی ترکیب سے زندگی کو زیادہ تقویت اور تخلیقی صلاحیتوں کو پختگی نصیب ہو سکتی ہے۔

زیرکی از عشق گردد حق شناس　　کارِ عشق از زیرکی محکم اساس

عشق چوں با زیرکی ہمبر شود　　نقشبندِ عالمِ دیگر شود

وہ کہتے ہیں کہ عقل بھی انسان کو منزلِ مقصود کی طرف لیجاتی ہے اور عشق بھی، لیکن دونوں کے طریقۂ کار میں اختلاف ہے، عقل حیلہ سازی کرتی ہے، وہم و گمان میں پڑتی ہے اور سود و زیاں، نفع و نقصان کے تصوّرات قائم بھی کرتی ہے اور اُن سے سہم بھی جاتی ہے اور اس طرح پس و پیش کرتے ہوئے منزل کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتی ہے — لیکن چونکہ عشق نے بجلی سے تڑپ اور نفس ہائے مسیح ابنِ مریم سے گرمی بھی حاصل کی ہے اس لئے وہ نہایت پھرتی سے حرکت کرتا ہے اور منزل کی طرف برق کی تیزی سے بڑھتا ہے۔!

ہر دو بمنزلے رواں، ہر دو امیرِ کارواں
عقل بہ حیلہ می برد، عشق برد کشاں کشاں

اِس سے ظاہر ہے کہ اقبال عقل کا احترام تو کرتے ہیں لیکن اہلِ جہاں کو اِس کی کوتاہیوں سے آگاہ بھی کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کے نزدیک عقل و ادراک کی

کوتاہیاں اور اِک حقیقت کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ اِسی سبب سے بوعلی عقل و منطق کی بنیاد پر حقیقت کی توجیہہ میں کامیاب نہ ہو سکے درآنحالیکہ رومی کے عشق نے ایک ہی جست میں اُنہیں منزلِ مراد تک پہنچا دیا ——!

بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم
دستِ رومی پردۂ محمل گرفت!

جدید تہذیب و تمدن کو عقلیت پر استوار کیا جا رہا ہے اور زندگی کی باقی قدروں کو جنھیں لطیف جذبات اور وجدانات سیراب کرتے ہیں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اقبال نے اِس جدید صورتِ حال کا جائزہ لیا اور محسوس کیا کہ اگر انسانی وجدان کا بیش بہا خزانہ خالی ہو گیا تو سلسلۂ تخلیق رک جائے گا اور انسانی تمدن غیر تخلیقی ہو کر فنا ہو جائے گا۔ چنانچہ اقبال عشق و عقل میں ایک خوشگوار امتزاج کے قائل ہیں جسے وہ انسانی بقا کے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہتے ہیں کہ

خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ
عشق را با زیرکی آمیز دہ!

اقبال کے کلام میں عشق ایک مستقل موضوع کی حیثیت رکھتا ہے انہیں یہ موضوع بہت پسند ہے، بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اُنہیں عشق سے عشق ہے! وہ کہتے ہیں کہ کائنات کی رنگینی اور عالمِ رنگ و بو کے عشوے محض عشق ہی کے سبب سے ہیں، پتوں کی دلکشی، پھولوں کا حسن اور زندگی کا سوز و ساز اسی کا رہینِ منت ہے ——!

بہ برگِ لالہ رنگ آمیزیٔ عشق — بجانِ ما بلا انگیزیٔ عشق
اگر ایں خاکداں را واشگافی — درونش بنگری خونریزیٔ عشق

دوسرے شعر میں اقبال نے ایٹم کے اصول کو حسن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ مادہ کے ایک ایک ذرہ، ایک ایک ایٹم کو چیر دیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس میں بھی الکٹران، پروٹان اور نیوٹران ایک فطری کشش اور گردش کے آئینِ مسلّم کے تحت ایک دوسرے سے جکڑے ہوئے اور ساری کائنات کے نظام کو برقرار رکھے ہوئے ہیں — گویا کہ محبت کا یہ جذبہ، یہ بے پناہ توانائی نباتات اور جمادات میں بھی پائی جاتی ہے اور عشق کی حکومت کائنات کے ذرہ ذرہ پر موجود ہے! — اور اِسی لیے تسخیرِ فطرت کا کام بھی اقبال عشق ہی سے لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ محبت جو انقلاب چاہتی ہے انسان کی نظر کو بلند تر کر کے اُسے کائنات کا حکمراں بنا دیتی ہے۔ اور اِس غرض کے لیے وہ انسان کو صرف محراب و منبر ہی تک محدود نہیں رکھتی بلکہ محفل رقص و سرود اور مجلسِ پند و نصیحت سے نکالکر معرکۂ حیات تک پہنچا دیتی ہے — !

نہاں اندر دو حرفے سرِّ کار است — مقامِ عشق منبر نیست، دار است
براہیماں ز نمرود اں نہ ترسند — کہ عودِ خام را آتش عیار است

اقبال بارگاہِ رسالت مآب (صلعم) میں

ہر کہ عشقِ مصطفیٰ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

گویا ذاتِ محمدؐ عربی رحمت کی ایک گھٹا تھی جو خشک آسمانوں پر پھیل گئی اور تپتی ہوئی انسانیت پر برس کر سبزہ و گُل کی افزائش کا سبب بنی۔ یا نور کی ایک کرن تھی جو اندھیروں کو چیرتی ہوئی دنیا کے پردہ پر آپڑی اور ایک عالم کو منوّر کر گئی۔ یا وہ روشنی کا ایک مینار تھی جو طوفان خیز سمندروں سے ابھری اور تاریک فضاؤں میں بلند ہو کر انسانیت کے سفینے کو نشانِ راہ دکھانے لگی ——!

۱۔ مقامِ محمدی

۲۔ وجہِ عقیدت

۳۔ سفر بہ مدینۂ منورّہ

۴۔ دربارِ مدینۂ طیبّہ

(ا) عشق و مستی (ب) لاالٰہ (ج) ملّت کا درد

(د) شرابِ محبّت (ج) تمنّائے دلی

اقبال بارگاہِ رسالت مآب صلعم میں

مقامِ محمدی محمد عربی ایک جلوۂ تاباں بن کر سینۂ فطرت سے ہویدا ہوئے۔ آپ کی نگاہوں نے رازِ ہستی کو روزِ روشن کی طرح عیاں کر دیا اور انسان کو خالقِ جہاں کے احکام کا ہمصفیر کر کے معبدِ عالم کا سرنشیں بنا دیا۔ آپ ہی کے فیض سے وہ غریب گلہ بان جو ابتدائے آفرینش سے ریگزاروں میں گمنام پڑے تھے دہلی سے غرناطہ تک اپنا سکہ چلانے لگے اور وہ مٹھی بھر شتربان جنھیں دنیا حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی ایک قلیل عرصہ میں سارے عالم پر اپنا پرچم لہرانے لگے —— اگر یا ذاتِ محمد عربی رحمت[1] کی ایک گھٹا تھی جو خشک آسمانوں پر پھیل گئی اور تپتی ہوئی انسانیت پر برس کر سبزہ و گل کی افزائش کا سبب بنی۔ یا نور کی ایک کرن تھی جو اندھیروں کو چیرتی ہوئی دنیا کے پردہ پر آپڑی اور ایک عالم کو منوّر کر گئی۔ یا وہ روشنی کا ایک مینار تھی جو طوفان خیز سمندر دل سے ابھری اور تاریک فضاؤں میں بلند ہو کر انسانیت کے سفینے کو نشانِ راہ دکھانے لگی!

[1] وما ارسلنک الا رحمۃ للعٰلمین (اے پیغمبرؐ ہم نے تجھے ہر دو جہاں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

چودہ صدیاں ختم ہو رہی ہیں لیکن روشنی کا یہ مینار اپنی جگہ موجود ہے۔ یہہ سراجِ منیر؎
پوری تابناکی کے ساتھ اپنی جگہ قائم ہے ——— اور اِس چراغ کے اطراف پروانوں
کی گردش بھی بدستور موجود ہے، اُن کی وارفتگی ہمیشہ کی طرح قائم ہے، ان کا
سوزِ دروں فزوں تر ہے اور امتدادِ زمانہ کے باوجود اِس چراغ کی لو سے وصل
کی آرزو کبھی کارلائلؔ کے دِل میں پیدا ہوتی ہے تو کبھی باسورتھ اور گبنؔ کے پہلو
میں کروٹ لیتی ہے، کبھی جلال الدین رومیؔ کو بیقرار کرتی ہے تو کبھی اقبال کی روح
کو سوز و ساز بخش دیتی ہے۔ اور یہی آرزو وہ ہے کہ جس کے باعث جنیدؓ و بایزیدؓ بارگاہِ
رسالتؐ پناہ میں داخل ہوتے ہیں تو اُن کے احساسات میں زلزلہ پڑجاتا ہے
اور اُن کے ہوش اُڑجاتے ہیں ——!

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؓ و بایزیدؓ ایں جا

تاریخ کے صفحات پہ بڑی بڑی شخصیتیں نظر آتی ہیں۔ سطحِ ارض پہ بڑے
باجبروت بادشاہوں نے حکومت کی ہے۔ بڑے بڑے سپہ سالاروں نے تلوار کی

؎ یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ۙ وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ
بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ٭
یعنی اے پیغمبر! ہم نے تجھ کو (حق پر) گواہ کرکے بھیجا اور تو (مسلمانوں کو جنت کی) خوشخبری سنانے والا
اور (کفار کو دوزخ سے) ڈرانے والا ہے۔ تو لوگوں کو اللہ کے حکم سے اُس کی طرف دعوت دیتا ہے
اور (اِس طرح دلوں کو) روشن کرنے والا چراغ ہے۔!

نوک سے دنیا کے طبقے اُلٹ دیئے ہیں، بلند پایہ فلسفیوں نے عجائباتِ عالم کی طلسم کشائی کی ہے اور عالی دماغ مقنّنوں نے دنیا کو منظّم کرنے کے لئے سخت دماغ پاشی بھی کی ہے ـــــ لیکن اِن بادشاہوں کی عظمت دلوں کی بستیوں پر اپنی حکومت قائم نہ کر سکی، سپہ سالاروں کی تلوار انسانی اوہام کی زنجیروں کو کاٹ نہ سکی، فلسفیوں کا پیچ وتاب حسنِ عمل کا کوئی نمونہ پیش نہ کر سکا اور مقنّنین کے افکار سے نوعِ انسان کے لئے کوئی مستقل نظامِ ہدایت مدوّن نہ ہو سکا ـــــ اس کے برعکس اپنے مسائل کے حل کے لئے دنیا کو ہمیشہ روحانی پیشواؤں ہی سے رجوع کرنا پڑا، صراطِ مستقیم کی تلاش میں خدا کے نبیوں ہی پر ایمان لانا پڑا اور ہر معاملہ میں اللہ کے رسولوں ہی سے اکتسابِ فیض پر مجبور ہونا پڑا ـــــ اور دنیا کی ان برگزیدہ ہستیوں میں اعلیٰ ترین مقام سید المرسلینؐ کو حاصل ہے کہ جن کی شخصیت جلال وجمال کا ایک حسین ترین مرقع ہے اور جن کے نقشِ قدم کاروانِ حیات کے لئے چراغِ راہ بن گئے ہیں! دیگر انبیاء کے برعکس آپؐ تمام عالمین اور تمام قوموں کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں کیونکہ آپ کا پیغام تمام انبیاء کی تعلیمات پر حاوی ہے اور آپؐ کا نور رنگ ونسل اور زبان وجغرافیہ کی ہر حد کو توڑ کر دنیا کے گوشہ گوشہ میں یکساں طور پر چمک رہا ہے ـــــ!

حُسنِ یوسف، دمِ عیسیٰؑ، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

دُنیا کے ہر دیانتدار مؤرخ نے آپؐ کے مقامِ بلند کا اعتراف کیا ہے اور ہر صحیح الدماغ مفکّر نے آپؐ کی رفعت کو تسلیم کیا ہے۔ فی الحقیقت آپؐ کا مقام

ہر مقام سے آگے ہے۔ اور اقبال کے نزدیک تو کوہِ طور کی حیثیت آپؐ کے غبارِ خانہ سے زیادہ نہیں ہے۔ آپ کا گھر کعبہ کے لئے باعثِ احترام ہے، 'ابد' آپؐ کی زندگی کے ایک لمحہ سے کمتر اہمیت رکھتا ہے اور 'دوام' آپؐ کی ذات سے فروغ حاصل کرتا رہتا ہے۔

طور موجے از غبار خانہ اش　　کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش
کمتر از آنے ز اوقاتش ابد　　کاسبِ افزائش از ذاتش ابد

وجہ عقیدت

سرورِ کائنات کی ذاتِ اقدس سے اقبال کی عقیدت ٹھوس حقائق پر مبنی ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ رسالتِ محمدیہؐ حریت کی تشکیل و تاسیس کا سبب اور بنی نوعِ آدم کی مساوات و اخوت کے قیام کا ذریعہ ہے ـــ آپؐ کی بعثت سے پہلے دنیا میں ایک انسان دوسرے انسان کا محتاج تھا۔ قیصر و کسریٰ انسانوں کو لوٹتے رہتے تھے۔ ہر جگہ انسان غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے جس کے باعث اُن کی صلاحیتیں مردہ ہو چکی تھیں ـــ یہاں تک کہ خدائے قدوس کی بے شمار رحمتوں کی بدولت سرکارِ دو عالم اِس دُنیا میں تشریف لائے اور غلاموں کو آقاؤں کی مسند عطا کی، حق داروں کو اُن کا حق پہنچایا اور ہر نقشِ کہن کو مٹا کر انسانیت کو استوار بنیادوں پر قائم کر دیا۔ آپؐ نے دُنیا کو حریت کی تعلیم دی اور نہ صرف ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کا بھائی بنا دیا بلکہ تمام امتیازات کو مٹا کر انسانی مساوات کو اپنی تعلیمات کی اساس قرار دیا ـــ!

بود انساں در جہاں انساں پرست　　ناکس و نابود مند و زیر دست

سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش | بند ہا در دست و پا و گردنش
از غلامی فطرتِ او دوں شدہ | نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ
تا امینے حق بحقداراں سپرد | بندگاں را مسندِ خاقان سپرد
قوتِ او ہر کہن پیکر شکست | نوعِ انساں را حصارِ تازہ بست
حریت زاد از ضمیرِ پاکِ او | ایں مئے نوشیں چکید از تاکِ او
کُلُّ مومن اخوۃٌ اندر دلش | حریت سرمایہ آب و گلش

ناشکیبِ امتیازات آمدہ
در نہادِ او مساوات آمدہ

نوعِ انسان کی تخلیق ایک ہی جوہر سے ہوئی ہے۔ لیکن رنگ و نسل کے امتیازات خاندان و قبیلہ کے تعصبات اور جغرافیائی حدود کے پیدا کردہ اختلافات نے اولادِ آدم میں ایسا سخت انتشار اور بغض و عناد پیدا کر دیا تھا کہ ایک انسان دوسرے انسان کا دشمن اور اس کے خون کا پیاسا ہو گیا تھا ان حالات میں سرورِ کائنات نے نوعِ انسان کو اتحاد اور یگانگت کی دعوت دی اور معجزۂ محمدی نے انسانی قلوب کو اخوت و محبت کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ دیا کہ پھر دنیا کی کوئی طاقت ان زنجیروں کو نہیں کاٹ سکتی۔ یہ آپ ہی کی تعلیم تھی کہ لاکھوں اور کروڑوں انسان جسمِ واحد کی طرح ایک ہو گئے اور ملت کے تمام اجزا ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے منسلک ہو گئے ــــ!

از رسالت صد ہزار ما یک است | جزو ما از جزو ما لا ینفک است

اقبال نے یہہ بھی محسوس کیا کہ رسالتؐ ہی کی بدولت ہمیں ایک مقصد اور ایک مدّعا حاصل ہوّا اور مُدّعا کی وحدت اور وحدت کی پختگی نے ہمیں ملّت کی شکل دے دی۔ یہہ وحدت جو ملّت کی حیات کا باعث ہے درحقیقت اُس دینِ فطرت کی مرہونِ منّت ہے جس کی تعلیم ہمارے نبیؐ نے ہمیں دی ہے اور جس کے نور سے ہم نے دنیا میں روشنی پھیلادی ہے۔ یہہ گوہرِ بیش بہار رسالتؐ ہی کے بحرِ بے پایاں سے ہم نے حاصل کیا ہے اور اُسی کے فیض سے ہماری ملّت متحد، مستحکم اور لازوال ہوگئی ہے ——!

از رسالت ہم نوا گشتیم ما
ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما

کثرتِ ہم مدعا وحدت شود
پختہ چوں وحدت شود ملّت شود

زندہ ہر کثرت ز بندِ وحدت است
وحدتِ مسلم ز دینِ فطرت است

دینِ فطرت از نبی آموختیم
در رہِ حق مشعلے افروختیم

ایں گہر از بحرِ بے پایانِ اوست
ما کہ یکجائیم از احسانِ اوست

آپؐ نے ملّتِ اسلامیہ کو مقام و مکان کی حدود سے آزادی عطا کی ہے

اور اس جوہر کو سطحِ ارض کے کسی حِصّہ سے وابستہ نہیں رکھا ہے۔ آپؐ نے مکّہ سے ہجرت کر کے قوم کے تصوّر سے "وطن" کے عنصر کو خارج کر دیا ہے اور کلمۂ توحید کو اِس کی بنیاد قرار دے کر ایک مِلّت کی تعمیر کی ہے کہ جس کے لئے تمام روئے زمین عبادت گاہ اور ساری دنیا جس کے لئے جولانگاہ بن گئی ہے!

جوہرِ ما با مقامے بستہ نیست
بادۂ تندش بجامے بستہ نیست

عقدۂ قومیّتِ مسلم کشود
از وطن آقائے ما ہجرت نمود

حکمتش یک مِلّتِ گیتی نورد
بر اساسِ کلمۂ تعمیر کرد

تا ز بخششہائے آں سلطانِ دیں
مسجدِ ما شد ہمہ روئے زمیں

اقبال کی نظر محمدؐ عربی کے اُس زبردست احسان پر بھی جا پڑی جسکی بدولت مِلّتِ اسلامیہ وقت کی دستبرد سے محفوظ اور زماں کی قیود سے بالاتر ہو گئی ہے۔ آپؐ ہی کے تدبّر سے اِس مِلّت کو حیاتِ جاوید اور آپؐ ہی کی نظر سے بقائے دوام نصیب ہوئی ہے۔ جان اور جسم کے باہمی ربط کے ٹوٹ جانے سے فرد کی موت واقع ہوتی ہے اور مقصدِ حیات کے موجود نہ ہونے سے قومیں

ہلاک ہو جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے سرورِ کائنات نے ملّتِ اسلامیہ کو ایک اعلیٰ ترین مقصدِ حیات بخشدیا ہے جس کی بدولت وہ وقت کے دھارے اور موت کے پنجۂ آہنی سے محفوظ ہو گئی ہے۔!

زندہ فرد از ارتباطِ جان و تن
زندہ قوم از حفظِ ناموسِ کہن
مرگِ فرد از خشکیٔ رودِ حیات
مرگِ قوم از ترکِ مقصودِ حیات
از اجل ایں قوم بے پروا ستے
استوار از نَحْنُ نَزَّلْنَا[۱] ستے
تا خدا اِن یُّطْفِؤُا[۲] فرمودہ است
از فسردن ایں چراغ آسودہ است

سرورِ کائنات کے ایسے ہی بے شمار احسانات پر اقبال کی نگاہ پڑتی

---

[۱] اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ ۔ یعنی ہم نے اتارا ہے قرآن شریف کو اور تحقیق ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

[۲] یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِؤُا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاہِہِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ ۝ یعنی وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے (یعنی پھونکوں سے) بجھادیں۔ اور اللہ اپنے نور کو مکمل کرنے والا ہے اگرچہ یہ بات کافروں کو بری لگی۔

جاتی ہے۔ ایک طرف آپؐ کی تعلیمات اور اصلاحات کا وہ مطالعہ کرتے ہیں تو دوسری طرف آپؐ کی پاکیزہ زندگی، اسرارِ حیات اور رموزِ کائنات پر آپؐ کی گہری نظر اور خدائے ذوالجلال کے نزدیک آپؐ کے مقامِ بلند سے ایسے متاثر ہوتے ہیں کہ اُن کی عقیدتمندی بیساختہ پکار اُٹھتی ہے کہ:-

می توانی مُنکرِ یزداں شدن
منکر از شانِ نبیؐ نتواں شدن

اور پھر غلامانِ محمدیؐ کے مظفرؔ و منصور کاروان موج در موج اقبالؔ کے تخیل کے پردہ سیمیں پر اُمڈنے لگتے ہیں — یہ کاروان ایک طرف وسطِ ایشیا تک قدم بڑھاتے ہیں اور افغانستان کے پہاڑوں کو عبور کر کے برِّ اعظم ہند پر پھیل جاتے ہیں تو دوسری طرف افریقہ اور اسپین سے گزر کر بحرِ ظلمات میں اپنے گھوڑے ڈال دیتے ہیں — ! عشقِ مصطفویؐ کی حرارت اور حوصلہ شکن مشکلات کو برف کی طرح پگھلا دیتی ہے۔ اور عاشقانِ رسولؐ کا پرچم تپتے ہوئے ریگزاروں، چٹیل میدانوں لہلہاتی ہوئی کھیتیوں، حسین سبزہ زاروں، پہاڑوں کی فلک بوس چوٹیوں اور طوفان خیز سمندروں کی مغرور موجوں پر اپنے جلال و جبروت کے ساتھ لہرانے لگتا ہے — !

ہر کہ عشقِ مصطفےٰ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست!

یہی عشق مصطفےٰؐ اقبال کے دل میں بھی پیدا ہوتا ہے اور اُن کی زندگی کو سوز و ساز کی لازوال دولت سے مالامال کر دیتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی زندگی کے خاموش ساز میں اسی کے شور کو موجود پاتے ہیں، اسی کے سبب سے بے شمار نغمے ان کی آغوش میں تڑپنے لگتے ہیں اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ اسی معشوق کے آئینہ سے اُن کے پیکر کی تخلیق اور اسی کے آفتابِ سینہ سے ان کی صبحِ زندگی روشن ہوتی ہے۔ اُن کے نزدیک مدینہ کی خاک دونوں جہاں سے زیادہ قیمتی ہے اور وہ شہر بابرکت ہے جس میں اُن کا معشوق موجود ہے ——!

شورِ عشقش در نئے خاموشِ من
می تپد صد نغمہ در آغوشِ من
پیکرم را آفرید آئینہ اش
صبحِ من از آفتابِ سینہ اش
خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

اقبال کی شیفتگی بڑھتی جاتی ہے اور وہ اپنے آقاؐ کو پیام دیتے ہیں کہ مجھے اپنے دربار میں طلب فرما لیجیے، کیونکہ میں آپؐ کے ہجر میں نالاں ہوں اور مسلسل نغماتِ درد سے میری روح بے چین ہو گئی ہے ——!

اے کہ دادی کُرد را سوزِ عرب
بندۂ خود را حضورِ خود طلب

جاں ز مہجوری بنالد در بدن
نالہ من وائے من ! اے وائے من
بندۂ اندر جہاں نالاں چوں نے
تفتہ جاں از نغمہ ہائے پے بہ پے

یہ عشق شدید تر ہوتا جاتا ہے اور اُنھیں کسی پہلو قرار نصیب نہیں ہوتا۔ وحشتِ دِل فزوں تر ہوتی ہے اور وہ اپنے دل کو بہلانے کے لئے کوہ و صحرا کی طرف نکل جاتے ہیں، مگر اس سے اُن کی افسردگی میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ وہ آبجو کے کنارے بیٹھ جاتے ہیں اور زار و قطار رونے لگتے ہیں۔

ندانم دِل شہیدِ جلوۂ کیست
نصیب او قرارِ یک نفس نیست
بصحرا بُردمش افسردہ تر گشت
کنارِ آبجوئے زار بگریست

سفر بہ مدینۂ طیبہ

پھر وہ یثرب کے لئے رختِ سفر باندھتے ہیں۔، سرورِ عشق و مستی میں گنگنانا شروع کرتے ہیں اور اُنہیں اُس تھکے ہوئے پرندے کی طرح کیف حاصل ہونے لگتا ہے جو شام کے وقت آشیانہ کی طرف لوٹ جانے کے لئے اپنے پر کھول دیتا ہے!

بہ ایں پیری رہِ یثرب گرفتم
نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام
کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

یثرب کا یہہ سفر جاری رہتا ہے۔ کاروان منزل بہ منزل چلا جاتا ہے ہر شخص مسرور ہے یہاں تک کہ قافلہ کے اونٹ بھی یثرب کے ذوق و شوق سے معمور نظر آتے ہیں — اقبال ضعیف ہیں۔ بیمار اور تھکے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی اونٹنی کے قدم تیز تر ہوتے جاتے ہیں۔ اِس لئے وہ اُسے کہتے ہیں کہ ذرا آہستہ چل۔ مگر یہہ سُن کر اُس کے قدم اور بھی مستانہ وار اُٹھنے لگتے ہیں جیسے کہ اُس کے پیر کے نیچے صحرا کی ریت ریشم و پرنیاں کی طرح نرم ہوگئی ہو —— !

سحر با ناقہ گفتم نرم تر رو
که راکب خستہ و بیمار و پیر است
قدم مستانہ زد چنداں کہ گوئی ،
بپایش ریگِ ایں صحرا حریر است

اِس بات پر شاید ساربان متوجہ ہو کر اونٹنی کو مہار دینا چاہتا ہے۔ لیکن اقبال اُس سے کہتے ہیں کہ نہیں اِس کی ضرورت نہیں کیونکہ اونٹنی کی روح بھی ہماری روح کی طرح دیدارِ محبوب کر رہی ہے۔ مجھے اُس کی رفتار ہی سے اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ بھی میری طرح دِل کے طلسم میں اسیر ہے — !

مہار اے ساربان اورا نشاید
کہ جانِ او چو جانِ ما بصیر است
من از موجِ خرامش می شناسم
چو من اندر طلسمِ دل اسیر است

وہ محسوس کرتے ہیں کہ اونٹنی کی چشمِ سیاہ میں آنسوؤں کی نمی موجود ہے۔ اُس کی آہِ صبحگاہی سے میرا دل بھی جل رہا ہے - وہی شرابِ عشق جس سے میرا ضمیر روشن ہو گیا ہے اُس کی موجِ نگاہ سے پے در پے ٹپک رہی ہے!

نمِ اشک است در چشمِ سیاہش
دلم سوزد ز آہِ صبح گاہش
ہماں مے کو ضمیرم را بر افروخت
پیا پے ریزد از موجِ نگاہش

عرب کا خشک صحرا بھی مبارک ہے کہ جس کی ہر ساعت دلنواز اور فرحت انگیز ہے - اُس کی راتیں چھوٹی ہیں، دن بڑے اور شام صبح خند ہے - اُس کے ذرّہ ذرّہ سے یثرب کے باشی کا عشق منعکس ہوتا ہے - اِس لئے اقبال اپنے ہمروانِ سفر سے کہتے ہیں کہ ان مقدس ذرّوں کا لحاظ کریں، اُن کی دردمندی کا احترام کریں اور اپنے قدم اِن پر آہستہ آہستہ رکھیں -!

چہ خوش صحرا کہ شامش صبح خنداست
شبش کوتاہ و روزِ او بلند است
قدم اے راہرو آہستہ تر نہ
چو ما ہر ذرۂ او دردمند است

کارواں جھومتا ہوا چلا جاتا ہے - ہر شخص عشقِ محمدی سے سرشار اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کیلئے بیقرار ہے - یکایک اگلی صفوں سے ایک آواز بلند ہوتی ہے —— یہ کون ہے؟ قافلہ والوں کی توجہ مبذول ہوتی ہے

اور بہت جلد ہر شخص جان لیتا ہے کہ یہ شمعِ محمدیؐ کا ایک اور پروانہ ہے جو ایران کی حدود کو عبور کر کے اس کاروان میں شامل ہو گیا ہے، یہ جامیؔ ہیں! اُن کا دل دھڑک رہا ہے۔ اُن کی بیخواب آنکھیں پھٹی پھٹی سی ہیں اور وہ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ آہنگِ راہ کو تیز تر کرو کیونکہ محبوبؐ کے دیدار کی شدید آرزو سے میری نیند حرام ہو گئی ہے اور میرا پیمانۂ صبر چھلکتا جا رہا ہے۔!

زود تر آہنگِ رہ کن کار زوئے اُو مرا
بردہ است از سینہ صبر از دیدہ خواب از دل قرار

جامیؔ شوقِ جمالِ یارؐ میں مستانہ وار قدم بڑھاتے ہیں۔ بیخودی کی کیفیت ان پر طاری ہے۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز معلوم ہوتے ہیں، یہاں تک کہ راستہ کے کانٹوں اور کنکروں کا بھی انھیں کوئی احساس نہیں ہوتا۔ وہ اُن پر سے اس طرح گزر جاتے ہیں جیسے کہ اُن کے پاؤں کے نیچے پھولوں کی سیج یا مخمل کا فرش بچھا ہوا ہے ـــــ!

اشترِ مستم کہ بیخود می روم در راہِ او
نیست در بینی مرا جز رشتۂ مہرش مہار
پائے کوباں میبرد شوقِ جمالِ او مرا
زیرِ پا ہم چوں حریر و گل بود خار او خار

جامیؔ کی اس حالت سے اقبال متاثر ہوتے ہیں۔ کبھی وہ اُن کا کلام دہراتے ہیں اور کبھی خود اپنے محبوبؐ کی شان میں اشعار کہنے لگتے ہیں۔

اِس پر لوگ امیرِ کارواں سے پوچھتے ہیں کہ یہہ غیر عرب کون ہے ؟ اُس کا سرود عربی اگرچہ نہیں ہے تاہم اس خشک صحرا میں بھی اُس کے نغموں سے دلوں کی آبیاری ہو رہی ہے۔!

امیرِ کارواں ! آں اعجمی کیست
سرودِ او بآہنگِ عرب نیست
زند آں نغمہ کز سیرابیِٔ او
خنک دل در بیابانے تواں زیست!

اقبال کو اِس سفر کا سوز و ساز پسند آتا ہے۔ غمِ جدائی کے شعلوں میں اُنہیں لطف آنے لگتا ہے۔ اِس لئے وہ ساربان سے کہتے ہیں کہ مجھے درِ یار تک کسی طویل راستہ سے لے چل ، جدائی کے اِن شعلوں کو تیز تر اور میری آہ و فغاں کو جنوں انگیز تر کر دے۔!

غمِ راہی نشاط آمیز تر کن
فغانش را جنوں انگیز تر کن
بگیر اے ساربان راہِ درازے
مرا سوزِ جدائی تیز تر کن !

اور پھر اپنے محبوبؐ کی یاد سے اُن کا دل بھر آتا ہے، جگر میں تیر سا لگتا ہے، آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں اور وہ اپنے ساتھی سے کہتے ہیں کہ اے ہم نفس ! آ کہ ہم ملکر روئیں کیونکہ ہم دونوں آقائے مدینہؐ کی شانِ جمال کے شہید ہیں۔ آ کہ ہم اپنے محبوبؐ کے دربار میں حاضر ہو کر اپنے دِل کی باتیں کہیں۔

دردِ جگر کا اظہار کریں اور اُس کے پاؤں پر اپنی آنکھیں ملیں ——!

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم
من و تو کشتۂ شانِ جمالیم،
دو حرفے بر مرادِ دل بگوئیم
بپائے خواجہ چشماں را بمالیم

دربارِ مدینہ

سچا عشق اپنا اثر رکھتا ہے۔ جذبِ دل محبت کا بہترین تیقن ہے۔ اور سوزِ دروں سے کامیابی کی اعلیٰ ترین ضمانت ہوتی ہے ——! اقبال کی صدا دربارِ مدینہ کی دیواروں سے ٹکراتی ہے۔ اُن کی فغاں سلطانِ مدینہ کے دِل پر اثر کرتی ہے۔ اور —— پھر کیا ہونا ہے! پھر اِس دربار کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے جاتے ہیں! اُس دربار کے دروازے ایک درویش کے لئے کھول دیئے جاتے ہیں۔ جہاں بڑے بڑے فلسفیوں کی کچھ پیش نہیں جاتی، جہاں بڑے باجرأت شہنشاہ لرزہ بر اندام ہوتے ہیں اور جہاں جنیدؒ و بایزیدؒ نفس گم کردہ، داخل ہوتے ہیں ——!!

حکیماں را بہا کمتر نہادند
بناداں جلوۂ مستانہ دادند
چہ خوش بختے چہ خرم روزگارے
درِ سلطاں بہ درویشے کشادند!

اِس دربار میں داخل ہوتے ہی اقبال کو عجیب کیفیت نظر آتی ہے۔

یہاں بقائے دوام ہے۔ یہاں فانی انسانوں کو حیاتِ جاودانی بخشی جاتی ہے، اسرارِ حیات کو منکشف اور حقائق کو بے نقاب کیا جاتا ہے۔ یہاں مسند نشینؑ کی نگاہوں کا فیض ہر شخص کے لئے جاری ہے اور حکیم ہو یا کلیم، دیدار کی اجازت ہر شخص کے لئے موجود ہے ——!

دریں وادی زمانی جاودانی
زخاکش بے صور روید معانی
حکیماں باکلیماں دوش بر دوش
کہ ایں جا کس نگوید لن ترانی!

اِس بارگاہ میں صوفی بھی ہیں اور فلسفی بھی، امیر بھی ہیں اور فقیر بھی، مقنّن بھی ہیں اور مؤرّخ بھی —— کوئی نعت خوانی میں مصروف ہے کوئی مسائلِ حیات پر اکتسابِ نور کر رہا ہے اور کوئی حالِ دردِ دل سنا رہا ہے۔ جامیؔ آگے بڑھ کر مسند نشینؑ کی خدمت میں سلام عرض کرتے ہیں کہ:-

السلام اے قیمتی تر گوہرِ دریائے جود
السلام اے تازہ تر گلبرگِ صحرائے وجود
السلام اے آنکہ تا از جبہۂ آدم نتافت
نورِ پاکش کس نبرد از قدسیاں او را سجود
السلام اے آنکہ زنگِ ظلمتِ کفر و نفاق
صیقلِ تیغِ تو از آئینۂ گیتی زدود
السلام اے آنکہ نامد در ہمہ کون و مکاں
تیز بیناں را بجز نورِ تو در چشمِ شہود

اہلِ کارواں نہایت ادب سے اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف ایک شخص کھڑا ہوتا ہے۔ یہ کارلائل[1] ہیں جو عیسائی علمار کے وفد کے ساتھ حضورِ رسالتؐ پناہ میں حاضر ہوئے ہیں۔ اُن کی نگاہیں جھکی ہوئی ہیں، دِل بیقرار ہے اور وہ حسنِ ادب کے ساتھ عرض کرتے ہیں۔

"اے رسولِ عربی! آپؐ کے حسین چہرہ سے ذکاوت ودیانت ٹپکتی ہے۔ آپؐ کی آنکھیں سیاہ اور چمکدار ہیں۔ اور مجھے تو آپؐ کی وہ رگِ جبیں بھی پیاری معلوم ہوتی ہے جو غصّہ کے وقت پھول کر سیاہ ہوجاتی ہے ——— اے اولوالعزم، جوشیلے، منصف مزاج اور صداقت پسند نبیؐ! اے پاک طینت، صاف باطن انسان!! آپؐ کے اندر جذبۂ ہوس پرستی اور شہرت طلبی نہیں ہے بلکہ خلوص وصداقت آپؐ کی شخصیت کی بنیاد ہیں... اور آپؐ کی نگاہوں کے سامنے رازِ ہستی اپنے بیم ورجا کیساتھ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے ———!

پھر وفد کے دوسرے رکن گبن[2] اپنے سینہ پر ہاتھ رکھکر عرض کرتے ہیں کہ:-
اے محمدؐ! کسی پیغمبر نے کبھی صداقت کا کوئی ایسا امتحان پاس نہیں کیا، جیساکہ آپؐ نے کیا ہے......

---

[1] انگلستان کا مایہ ناز ادیب، مؤرخ اور فلسفی

[2] یورپ کا مشہور مؤرخ

اور گاڈفری ہیگنس[1] جگر تھام کر کہتے ہیں کہ:۔

"اے تاجدارِ مدینہ! آپ کے حیات آفریں پیغام نے وہ نشہ آپؐ کے پیروؤں میں پیدا کر دیا ہے کہ جس کو عیسیٰؑ کے پیروؤں میں تلاش کرنا بے سود ہے"

اِس پر باسورتھ[2] بے چین ہو کر عرض کرتے ہیں کہ:۔

"آپؐ کی کتاب (قرآن مجید) کی جوہری صداقت میں کوئی شخص سنجیدہ شک نہ کرے گا..... آپؐ کا دماغ اُس روحانیت سے لبریز ہے جو اس (کتاب) کے اندر بند ہے ۔۔۔!"

اے کہ در مدحت نہ تنہا دوستاں رطب اللساں
دشمناں ہم پیش پائے تو سر انداختند

عیسائی وفد کی گفتگو ختم ہوتی ہے تو عرفی کی نوا سے ورد سے ایک سکتہ سا پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرا دل آپؐ کی محبت سے معمور ہے، میری روح آپؐ ہی کے غم سے لبریز ہے۔ ایسی صورت میں آپؐ کیلئے میں کونسی جگہ خالی کر سکتا ہوں۔ میرے ذہن میں ہزاروں باتیں آ رہی ہیں لیکن میں ایک بات کو بھی پوری طرح ادا نہیں کر سکتا ہوں۔ یہ آپؐ کی شخصیت اور حُسن وجمال کا اثر ہے کہ جس

---

[1] ملاحظہ ہو گاڈفری ہیگن کی کتاب "اپالوجی فار محمدؐ"۔

[2] باسورتھ اسمتھ کی کتاب لائف آف محمدؐ

کی روشنی سے یہہ محفل بقعۂ نور ہو گئی ہے ــــــ!

جان و دلِ من پُر از غمِ تست
بہرِ تو تہی کنم چہ جارا
آمادہ صد سرود در دم
ناکردہ تمام یک نوا را
در انجمن جمالِ رویت
بگرفتہ ز آفتاب جارا

عشق و مستی اقبال کے جذبات بھی اپنے محبوب کے دیدار سے اُبھر آتے ہیں، شعلۂ عشق بھڑک اُٹھتا ہے اور وہ زار و قطار رونے لگتے ہیں۔ رونے کا سبب دریافت فرمایا جاتا ہے تو وہ عرض کرتے ہیں کہ یہہ صورتِ حال آپؐ ہی کے غمِ عشق کا نتیجہ ہے۔ اسی غم سے میرے دِل کی حرارت، اِسی سے میری نواہیں اثر اور اسی سے میرے ضمیر کی روشنی ہے ــــ اور میں اس لئے روتا ہوں کہ ملکِ ہند میں ایک شخص بھی میں نے ایسا نہیں دیکھا جو آپؐ کا محرم ہو۔

تب و تابِ دل از سوزِ غمِ تست
نوائے من ز تاثیرِ دمِ تست
بنالم زانکہ اندر کشورِ ہند
ندیدم بندۂ کو محرمِ تست

اقبال اپنی غیر متزلزل محبت کو واضح الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ

آپ ہی میرے خیالات کا محور اور میری امیدوں کا مرکز ہیں۔ آپ ہی میری زندگی کا مقصد اور میری حیات کا سہارا ہیں۔ میں اپنا افسانۂ غم کس کو سناؤں کہ میرے سینے میں آپ کے سوا کوئی موجود نہیں ہے۔

درونِ ما بجز دودِ نفس نیست
بجز دستِ تو مارا دسترس نیست
دگر افسانۂ غم باکہ گوئیم ،
کہ اندر سینۂ ما غیر از تو کس نیست

پھر اس بارگاہِ رسالتؐ پناہ میں اپنے حالات بیان کرنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں اپنے لئے کسی اور کی مدد تلاش نہیں کرتا کیونکہ آپ ہی کے آفتاب کے فیض سے میرے ارتقا کا عمل جاری ہے اور میری اِس بے نیازی اور خودداری کے باعث میری نگاہ ماہ و پروین سے بلند تر ہو گئی ہے ـــــ!

نم و رنگ از دمِ بادے نجوئیم
ز فیضِ آفتابِ تو بروئیم
نگاہم از مہ و پروین بلند است
سخن را بر مزاجِ کس نگوئیم

اور آپؐ کے حکم کی محض تعمیل میں مکّہ کی راہ میں نے اختیار کی ورنہ آپؐ کے سوا میری اور کوئی منزل نہیں ہے۔

تو فرمودی رہِ بطحا گرفتم
وگرنہ جز تو مارا منزلے نیست

اس لئے مجھے اپنے دربار سے نکال نہ دیجئے کہ میں آپؐ کا مشتاق ہوں اور دردِ عشق کے باعث بیقرار اور ناصبور ہو گیا ہوں۔ آپؐ صبر کے علاوہ مجھے ہر حکم دے سکتے ہیں کیونکہ آپؐ کے ہجر میں صبر میرے بس کی بات نہیں ہے ـــــ

مراں از در کہ مشتاقِ حضوریم
ازاں دردے کہ دادی ناصبوریم
بفرما ہرچہ می خواہی بجز صبر
کہ ما از وے دو صد فرسنگ دوریم

اور میں آپؐ کو چھوڑ کر کہاں چلا جاؤں کہ ساری دنیا تو عشق سے پیدا ہوئی ہے لیکن نورِ عشق کی تخلیق آپؐ کے سینہ سے ہوئی ہے اور خود جبرئیلؑ بھی آپؐ ہی کے آئینہ کا ایک جوہر ہے ـــــ!

جہاں از عشق و عشق از سینۂ تست
سرورش از مئے دیرینۂ تست
جز ایں چیزے نمی دانم ز جبریلؑ
کہ او یک جوہر از آئینۂ تست

اور حضورؐ میں نے علمِ حاضر کے طلسم کو توڑا ہے، اُس کے دام کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔ اس علم کے شعلے بھڑکتے رہے ہیں لیکن خدا شاہد ہے کہ میں اِن شعلوں پر حضرت ابراہیمؑ کی طرح بے پروا بیٹھا رہا ہوں۔!

طلسمِ علمِ حاضر را شکستم
ربودم دانہ و دامش گسستم
خدا داند کہ مانندِ براہیمؑ
بہ نارِ او چہ بے پروا نشستم

میں اپنے سن شعور ہی سے آپؐ کے نور سے استفادہ کر رہا ہوں۔ میں نے ابتدا ہی میں آپؐ کے نور سے اپنے مقام کو دیکھا ہے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے اس بتخانہ میں اپنی نوائے صبحگاہی سے میں نے ایک جہانِ عشق و مستی تعمیر کر لیا ہے۔!

چو خود را در کنارِ خود کشیدم
بہ نورِ تو مقامِ خویش دیدم
دریں دیر از نوائے صبحگاہی،
جہانِ عشق و مستی آفریدم،

میری روح کی تپش آپؐ ہی کے کرم کی مرہونِ منت ہے، میری فکر کا پیچ و تاب آپؐ ہی کی نگاہِ لطف کا پیدا کردہ ہے، میرے دل کی بیقراری آپؐ ہی کے دم کا فیض ہے اور تاکِ زندگی میں موجِ شراب آپ ہی کے زمزم سے آئی ہے۔ اور چونکہ میرا دل آپؐ کا راز دار ہے اس لیئے تمام مادّی قدریں میری نظر میں بدل گئی ہیں اور ملکِ جمشید میری درویشی سے شرمندہ ہونے لگا ہے ۔۔۔!

مرا ایں سوز از فیضِ دمِ تست

تاکم موجِ مے از زمزمِ تست

خجل ملکِ جم از درویشیِ من

کہ دل در سینۂ من محرمِ تست!

میں تلاشِ محبوب میں ساری دنیا میں گھومتا رہا ہوں۔ اپنے دل کو ہتھیلی پر رکھکر صحراؤں کی خاک چھانتا رہا ہوں، موجوں کے تھپیڑے کھاتا رہا ہوں، لیکن مجھے کوئی دلبر نصیب نہ ہو سکا۔ میرے دل کی دولت کو لوٹنے والا کوئی غارتگر مجھے نہیں مِل سکا۔ اور اب سینۂ سوزاں کو لئے ہوئے آپؐ کے دربار میں حاضر ہوا ہوں۔ اس لئے میرے سینہ میں آئیے اور یہاں قیام کیجئے۔ میرے بے چین دِل کو سکون عطا کیجئے، میری تنہائی پر رحم کیجئے کیونکہ دنیا میں کوئی مسلمان مجھ سے زیادہ تنہا نہیں ہے ـــ!

دلے برکف نہادم، دلبرے نیست

متاعے داشتم، غارتگرے نیست

درونِ سینۂ من منزلے گیر

مسلمانے ز من تنہاترے نیست

محبّت کی کیفیّت اور عشق کی داستان سنانے کے بعد اقبال اپنے محبوبؐ کی بارگاہ میں اپنی نذر پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اے میرے محبوبؐ! ہندوستان سے طویل سفر طے کر کے آیا ہوں اور ایک ادنیٰ نذر بھی اپنے ساتھ لایا ہوں۔ یہہ نذر کیا ہے؟ ـــ آپ کی دہلیز کے لئے یہہ میرا

سجدۂ ذوق و شوق ہے جو محبت کی شدّت کے باعث میری پیشانی میں خون بن کر رہ گیا ہے۔

بہرِ دہلیزِ تو از ہندوستاں آوردہ ام
سجدۂ شوقے کہ خوں گردید در سیمائے من

ایک اور حقیر تحفہ بھی آپؐ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں جس میں میرا خون موجود ہے۔ میرا خون بہت اثر آفریں ہے۔ یہی میرے جنونِ عشق کا باعث ہے اور اسی سے قبائے لالہ رنگین ہو گئی ہے —— یہہ تحفہ کیا ہے؟ یہ میرا دلِ بیقرار ہے، میری زندگی کی متاع، میری کاوشوں کا حاصل اور میری محبّت کا جوہر ہے۔ خدارا اسے قبول کیجئے، اِس غلام کو سرفراز فرمائیے کہ اِس کے پاس متاعِ دِل کے سوا کچھ اور موجود نہیں ہے ——!!

دمید آں لالہ از مشتِ غبارم
کہ خونش می تراود از کنارم
قبولش کن ز راہِ دلنوازی،
کہ من غیر از دلے چیزے ندارم

اقبال کی یہہ نذر پیش ہوتی ہے، اُن کے تحفہ کو شرفِ قبولیت بخشا جاتا ہے اور اُن سے اُن کی مُراد پوچھی جاتی ہے۔ اِس پہ اقبال کے دِل میں ایک نیا ولولہ، ایک نیا جوش پیدا ہوتا ہے اور وہ عرض کرتے ہیں کہ اے میرے آقاؐ! آپؐ کا ظہور حیات کا شباب ہے اور آپؐ کا جلوہ خوابِ زندگی کی ایک نئی تعبیر ہے۔ آپؐ کا وجود کائنات کا قیمتی سرمایہ ہے جس سے

اُس کا مرتبہ بلند تر ہو گیا ہے — اور جب سے میری نظر آپؐ کے چہرۂ مبارک پر پڑی ہے آپؐ میرے والدین سے بھی زیادہ محبوب ہو گئے ہیں آپؐ کے درشن سے میری روح میں تپش پیدا ہوئی ہے۔ میرے عشق کے شعلے بھڑک اُٹھے ہیں اور میرے سینے میں آگ لگ گئی ہے —! آپؐ کی نظرِ کرم حیوان کو بھی انسان بنا سکتی ہے، اِس لئے حضورؐ میرے حق میں یہ دُعا کیجئے کہ میرا عشق عمل سے ہم آہنگ ہو جائے تاکہ میں جو قطرۂ آبِ نیساں ہوں آپؐ کے طفیل سے گوہرِ بیش بہا بن جاؤں۔!

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی
جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی

از تو بالا پایۂ ایں کائنات
فقرِ تو سرمایۂ ایں کائنات

تا مرا افتاد بر رویت نظر
از اب و امّ گشتۂ محبوب تر

عشق در من آتشے افروخت است
فرصتش بادا کہ جانم سوخت است

اے کہ از احسانِ تو ناکس کس است
یک دعایت مزدِ گفتارم بس است

عرض کن پیشِ خدائے عزّ و جل
عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل

در عمل پائندہ تر گرداں مرا
آبِ نیسانم گہر گرداں مرا

میری خاک میں شرر پنہاں ہیں، میری آہِ سحر کا سلسلہ جاری ہے
اور میں ایک نگاہِ برق انداز کا آرزومند ہوں۔ اس لئے مجھے آزمایئے،
میری آنکھوں پر اپنی تجلی کو مرکوز فرمایئے اور دیکھئے کہ اس ضعیفی کے باوجود
مجھے تابِ نظر حاصل ہے ——!

ہنوز ایں خاک دارائے شرر ہست

ہنوز ایں سینہ را آہِ سحر ہست

تجلّی ریزہ بر چشمم کہ بینی

بایں پیری مرا تابِ نظر ہست

اِس نوبت پر اقبال ذرا آگے بڑھتے ہیں اور اِس محفلِ مئے عشق میں ساقی
سے قریب تر ہو کر عرض کرتے ہیں کہ اے ساقی! محبّت کی شراب مجھے دیجئے،
جامِ شراب کو گردش میں لا کر سوزِ نے میں اضافہ کیجئے اور میرے سینے میں
ایسا دل رکھ دیجئے کہ جس کی بدولت میں کاؤس اور کیقباد کا پنجہ موڑ سکوں۔!

بیا ساقی بگرداں جامِ مے را

زمے سوز ندہ تر کن سوزِ نے را

دگر آں دل بنہ در سینۂ من

کہ پیچم پنجۂ کاؤس و کے را!

لاالٰہ

مئے عشقِ مصطفےٰ نوش کرنے سے اقبال کا دماغ روشن تر اور
اور ذہن تیز تر ہو جاتا ہے۔ معاً ان کے لہجے میں سنجیدگی پیدا
ہوتی ہے اور وہ بارگاہِ رسالتؐ پناہ میں رموزِ کائنات پر گفتگو کرنے لگتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ آپؐ نے دُنیا کو لاالٰہ کی تعلیم دی ہے۔ یہی لا الٰہ کائنات کی بنیاد اور اُس کا جوہر ہے۔ اسی سے سوز و سرور کا لطف ہے اور اسی سے انسان کے اندیشے رفع اور تاریک خیالات روشن ہو جاتے ہیں۔

لذّتِ سوز و سرور از لاالٰہ
در شبِ اندیشہ نورِ لاالٰہ

لیکن اِس لاالٰہ کی عملی مشکلات بے شمار ہیں۔ اِسی سبب سے جب میں خود کو مسلمان کہتا ہوں تو لرز جاتا ہوں: تاہم آپؐ ہی کے نور سے اپنی نگاہ کو روشن کرتا ہوں جس کی بدولت میں لاالٰہ کی حقیقت تک بھی پہنچ سکتا ہوں اور رموزِ کائنات کو بھی سمجھ سکتا ہوں—!

بنورِ تو برافروزم نگہ را
کہ بینم اندرونِ مہر و مہ را
چو می گویم مسلمانم، بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لاالٰہ را

نورِ مصطفٰےؐ کے فیضان سے اقبال کے قلب و نظر مستنیر ہو جاتے ہیں۔ وہ اِس بات کا اقرار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے میرے آقاؐ! میری آنکھوں کو آپؐ ہی نے نگاہ بخشی ہے۔ لاالٰہ کی تابناکی آپؐ ہی نے مجھے عطا کی ہے اور میری شبِ زندگی میں چاند کی روشنی آپؐ ہی کی لائی ہوئی ہے۔ اب مجھے آپؐ کا رُخِ زیبا دل بھر کے دیکھ لینے دیجئے کیونکہ آپؐ کو دیکھنا خدا کو دیکھنے کے مترادف ہے—!

بچشمِ من نگہ آوردۂ تست — فروغِ لاالٰہ آوردۂ تست
دوچارم کن بہ صبح "من رآنی"[1] — شبم را تابِ مہ آوردۂ تست

"لاالٰہ" بے پناہ قوت کا حامل ہے۔ برق کی اِس میں تیزی ہے، اور جوہر کی توانائی اِس میں موجود ہے۔ اِس کے صحیح استعمال میں بڑے بڑے ہنگامے پوشیدہ ہیں اور بے شمار انقلابات کا یہہ امین ہے۔ اِس لیۓ تیغِ "لا" میرے ہاتھ میں دیجئے اور پھر دنیا میں الّا کے اثرات کو دیکھیۓ۔

تیغِ "لا" در کفِ این کافرِ دیرینہ دہ
باز بنگر در جہاں ہنگامۂ الّاۓ من

لاالٰہ کے رموز کو میں سمجھ رہا ہوں اور الّا اللّٰہ کے متعلق یہہ جانتا ہوں کہ آپؐ کی ذات اِس کی روحِ رواں ہے۔ آپؐ نے خود کو "عبدہٗ" یعنی بندۂ حق کہا ہے۔ "عبدہٗ" دراصل کلمۂ توحید کا جوہر ہے کیونکہ حدیثِ قدسی کے مطابق بندۂ حق ذکر و عبادت میں محویت کی بدولت اس مقام پہ پہنچ جاتا ہے جہاں خدا کی آنکھ اُس کی آنکھ اور خدا کی زبان اُس کی زبان بن جاتی ہے جس سے وہ دیکھتا ہے اور باتیں کرتا ہے — یہی وجہ ہے کہ انقلابات آپؐ کی چشم و ابرو کے ایک ادنیٰ اشارہ کے منتظر رہتے ہیں اور تقدیروں کا بدل جانا آپؐ کی معمولی توجہ کا کرشمہ ہوتا ہے —!

---

[1] من رآنی فقد رآ اللّٰہ (حدیث شریف) یعنی جس نے مجھے دیکھا اُس نے گویا خدا کو دیکھا؛ یہہ اِس لحاظ سے کہ سرورِ دو عالم اخلاقِ الٰہی کے کامل منظہر ہیں۔

عبدہ، صورت گرِ تقدیر ہا	اندرو ویرانہ ہا، تعمیرہا
کس ز سرِّ عبدہ، آگاہ نیست	عبدہ، جز سرِّ الّا اللہ نیست

ملّت کا درد

لیکن اس عشق و مستی کے باوجود ملّت کا درد اقبال کے دِل میں موجود رہتا ہے اور جس بیتابی سے وہ اپنی محبت اور وارفتگی کا اظہار کرتے ہیں اُسی بیتابی سے وہ قوم کی حالتِ زار کو بھی حضورِ رسالت پناہؐ میں پیش کر کے اُس کی اصلاح کی درخواست کرتے ہیں — وہ کہتے ہیں کہ مسلمان کا سینہ سوز سے خالی ہو گیا ہے۔ اُس کا دِل روتا تو ہے لیکن وہ اس آہ وزاری کے سبب سے ناواقف اور اپنے مقصدِ حیات سے ناآشنا ہو گیا ہے۔ اس لئے یا رسول اللہ! آپ کی ایک نگاہ کی ضرورت ہے۔!

مسلماں آں فقیرے کج کلا ہے	رمید از سینۂ او سوز آہے
دلش نالد! چرا نالد! نداند،	نگاہے یا رسول اللہ نگاہے

مسلمانوں کا کاروان اپنی منزل سے دور ہو گیا ہے۔ اُن کا نظامِ حیات بگڑ چکا ہے۔ اُن کے خون میں حرارت باقی نہیں ہے، ضمیر اثر آفرینی سے محروم ہو گیا ہے، اقتصادی حالت تباہ ہے۔ عسکریت کا جوہر زائل ہو چکا ہے اور قرآن کو جس کے فیض سے وہ ایک عالم کی بادشاہی کرتے رہے ہیں اُنھوں نے طاقِ نسیاں کے سپرد کر دیا ہے۔!

نماند آں تاب و تب در خونِ نابش	نروید لالہ از کشتِ خرابش،
نیام او تہی چوں کیسۂ او،	بطاقِ خانۂ ویراں کتابش

مسلمان دِل کی دنیا سے ناآشنا ہے۔ خودی کا جوہر اُس میں مفقود

ہو گیا ہے۔ بانگِ تکبیر کی برکتوں سے اُس کا ضمیر خالی ہے اور اُس کا منصب العین اُس کی آنکھوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ اس لئے اے آقائے مدینہ! اُس کے جوہر کو بقا کی عطا کیجئے، اس کے دِل میں ایک دنیا آباد کیجئے اور اس کے چراغِ زندگی کی حفاظت فرمائیے جو اُس کے دامنِ چاک چاک میں زمانہ کی تیز آندھیوں کے سبب سے بھڑک رہا ہے۔

دگر پاکیزہ کن آب و گلِ او　　جہانے آفریں اندر دلِ او
ہوا تیز و بدامانش دو صد چاک　　بیندیش از چراغِ بسملِ او

اُس کی زندگی غیر کی فکر کے تابع ہے۔ وہ موت سے خائف اور اسرارِ مرگ سے ناواقف ہے۔ اس کا شیخ علم الاساطیر (mythology) کو اپنی متاع سمجھتا ہے۔ وہ تخمین و ظن میں الجھا ہوا ہے اور اسلام کو کفر کی طرف اور حرم کو دیر کی طرف لیجا رہا ہے۔

متاعِ شیخ اساطیرِ کہن بود　　حدیثِ او ہمہ تخمین و ظن بود
ہنوز اسلامِ او زنار دار است　　حرم چوں دیر بود او برہمن بود!

مسلمان جب تک آپؐ کی تعلیم کے پابند رہے، شہنشاہوں کے گریبان چاک کرتے رہے۔ لیکن ایمان کی آگ جب سینے میں سرد پڑ گئی تو وہ غیر اللہ کے سامنے سر جھکانے لگے۔ مجھے یا رسول اللہ، شکایت خود اپنوں سے ہے کہ وہ آپؐ کے شایانِ شان نہیں رہے۔

جبیں را پیشِ غیر اللہ سودیم　　چو گبراں در حضورِ او سرودیم
ننالم از کسے، می نالم از خویش　　کہ ما شایانِ شانِ تو نبودیم

خانقاہیں ذوق وشوق سے خالی ہو گئی ہیں۔ مدرسوں میں اندھی تقلید کے سوا کچھ نہیں ہے۔ شاعری بے جان اور نغمہ بے کیف ہو گیا ہے مسلمان کا ایمان مردہ اور اُس کی بصیرت زائل ہو گئی ہے۔ بے یقینی کا وہ شکار ہے اور تمام اسباب خیر سے ناامید ہو گیا ہے ــــ ملاّ منبر پر بیٹھے دار گفتگو کرتا ہے اور ہر بات کی سند کتابوں سے پیش کرتا ہے۔ لیکن اُس کو ملّت کا کوئی درد نہیں ہے، اُس کی آنکھ میں نمی باقی نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے آپ سے بھی بے خبر ہو گیا ہے ــــ یارسول اللہ! مسلمانوں کی ایسی حالتِ زار پر ایک رات خدا کے سامنے میں پھوٹ پھوٹ کر رویا اور پوچھتا رہا کہ مسلمان ہر جگہ کیوں ذلیل وخوار ہیں۔ حضورِ حق سے مجھے جواب ملا کہ اِس ذلّت وخواری کا اصل سبب یہ ہے کہ مسلمان اپنا نصب العین کھو چکے ہیں، وہ اپنے سینے میں دِل تو رکھتے ہیں لیکن اس دِل کے لئے کوئی معشوق نہیں رکھتے ــــ!

شبے پیشِ خدا بگریستم زار مسلماناں چرا زارند و خوارند،
ندا آمد، نمی دانی کہ ایں قوم دلے دارند و محبوبے ندارند

مسلمانوں کو دنیا کا ہر غم گھن کی طرح کھایا جا رہا ہے۔ وہ دنیا کی ہر طاقت سے خوف کرتے ہیں اور موت کو بلائے ناگہانی سمجھتے ہیں ــــ میں اپنے نغموں کے سوز میں جلتا رہا ہوں اور آپ کی بخشی ہوئی قوّتِ پرواز کی بدولت تمام عالم میں اُڑتا پھرا ہوں لیکن مجھے ایک بھی مسلمان ایسا نہیں مل سکا جس کی ہیبت سے موت لرزہ براندام ہوتی ہو۔

بآں بالے کہ بخشیدی پریدم، بسوزِ نغمہ ہائے خود تپیدم،
مسلمانے کہ مرگ از وے بلرزد جہاں گردیدم و اُورا ندیدم

مگر اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان کو اُس کا مقام دکھایا جائے، اُس کے جوہر سے زنگ کو دور کر دیا جائے۔ اُسے رموزِ کائنات سے واقف اور اسرارِ مرگ وحیات سے روشناس کرایا جائے۔ اِس لئے اے سیدُ الثقلین! اِس فقیر کے سوز سے مسلمان کو آتشیں ضمیر فراہم کیجئے اور اس کے دِل کو ایمان وایقان کی طاقت اور اُمید کی روشنی عطا کیجیے، جس سے اُس کے قلب ونظر کو استحکام نصیب ہو سکے۔

زسوزِ ایں فقیرے رہ نشینے — بدہ اورا ضمیرِ آتشینے
دلش را روشن و پایندہ گرداں — زامیدے کہ زاید از یقینے!

مسلمان کو میں نے اُس کی خودی سے روشناس کرا دیا ہے۔ اب اُس کے دِل سے دنیوی خوف اور غم کو نکال دینے کی ضرورت ہے، اس لئے اے سراجُ السالکین! میرے نالوں کو ایسی تپش بخشیئے کہ جس کے ذریعے میں بجز غمِ دیں کے ہر غم کو جلا کر راکھ کر سکوں ——!

خودی دادم زخود نامحرمے را — کشادم در گِلِ او زمزمے را
بدہ آں نالۂ گرمے کہ از وے — بسوزم جز غمِ دیں ہر غمے را

مِلّتِ اسلامیہ جوانانِ پاکباز سے خالی اور سرودِ عشق ومستی سے محروم ہو گئی ہے۔ وہ کمزور، معذور اور غیر کی نگاہِ کرم کی محتاج ہو گئی ہے۔ اور یہی صورتِ حال اُس کے زوال و پستی کا باعث ہے۔ اس لئے امام القبلتین! اِس مِلّت کو جوانانِ پاکباز عطا کیجیے اور اپنی خانہ ساز شراب کے سرور سے اُنہیں سرفراز کر کے دِلِ بے نیاز اور بازوئے حیدرؓ انھیں بخشدیجئے——!

بدہ او را جوانِ پاکبازے — سرورش از شرابِ خانہ سازے
قوی بازوئے او مانندِ حیدرؓ — دلِ او از دو گیتی بے نیازے

شرابِ محبّت

اقبال قوم کی حالتِ زار بیان کر ہی رہے ہیں کہ انھیں ایک دردانگیز صدا سنائی دیتی ہے اور اُن کی توجہ جامیؔ کی طرف مبذول ہو جاتی ہے جو سرورِ کائنات سے عرض کرتے ہیں کہ اے شفیع المذنبینؐ! میں خطاوار ہوں، گناہوں کے بوجھ سے میری گردن جھکی جارہی ہے، تاہم آپؐ کا عشق میری زندگی کا سہارا اور میری نجات کا ذریعہ ہے۔ میری فقیری، عاجزی اور دردمندی میرے اس عشق کے شاہد ہیں۔ اور میری محنت و مشقت اور میرے رنج و غم کا اس قدر صلہ کافی ہے کہ مجھے آپ کی چوکھٹ پر جبینِ نیاز کے رکھ دینے کا موقع نصیب ہوا ہے —!

یا شفیع المذنبیں بارِ گناہ آوردہ ام — بر درت ایں بار با پشتِ دوتاہ آوردہ ام
عجز و بے خویشی و درویشی و دلریشی و درد — ایں ہمہ بر دعویٰ عشقت گواہ آوردہ ام
دولتم ایں بس کہ بعد از محنتِ رنجِ دراز — بر حریمِ آستانت می نہم روئے نیاز

جامیؔ کی اس نوائے درد سے اقبال کی شخصی محبّت کے دریا میں پھر تموّج پیدا ہوتا ہے اور وہ بیتاب ہو کر آقائے نامدار کے پاؤں پر اپنی آنکھیں ملنے اور اپنی پلکوں سے درِ یارؐ کی جاروب کشی کے لیے جھک جاتے ہیں —— لیکن سلطان ابنِ سعود دربار کے ایک کونے سے اُٹھ کر اعتراض کرتا ہے کہ اسلام میں غیر اللہ کو سجدہ ناجائز ہے۔ اس پر اقبال بل کھا کر اُس کی طرف دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے ابنِ سعود، تو نے شرابِ

محبتِ مصطفےٰؐ پی ہی نہیں ہے ورنہ تجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ میرا سجدہ نہیں ہے بلکہ میں اپنی صفِ مژگان سے آستانۂ رسولؐ کو جھاڑ رہا ہوں —!

تو ہم آں مے بگیر از ساغرِ دوست | کہ باشی تا ابد اندر برِ دوست
سجودے نیست اے عبدالعزیزؓ ایں | بروبم از مژہ خاکِ درِ دوست!

تمنّائے دلی اقبال کی اس گفتگو سے ساقیٔ کوثرؐ کا دل بھر آتا ہے۔ اُن کی محبت کا اعتراف کیا جاتا ہے، انہیں مقامِ بلند سے سرفراز فرمایا جاتا ہے اور اپنی تمنّائے دلی کے اظہار کا حکم دیا جاتا ہے۔

اس پر اقبال بکمالِ ادب عرض کرتے ہیں کہ اے راحت العاشقین! اے رحمۃ للعٰلمین!! مجھ گنہگار کو اپنی آرزو کے اظہار سے شرم آتی ہے۔ لیکن چونکہ آپ کی شفقت اور رحمت سے میری ہمّت افزائی ہو رہی ہے اس لیے عرض کرتا ہوں کہ میری ایک ہی دلی آرزو ہے۔ یہی آرزو مجھے بے چین کئے ہوئے ہے، یہی میرے درد و کرب کا باعث ہے اور اسی کے شعلوں میں جل رہا ہوں —! مجھے اس ارضِ پاک سے اُنس ہے، عرب کے اس صحرا سے الفت ہے، اس ریگزار کا ایک ایک چپہ مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے اور اس کے ایک ایک ذرّہ میں میرا حجلۂ عشق و محبت آراستہ ہے —! اس لئے میری تمنّائے دلی ہے کہ میں یہیں مروں، یہیں دفن ہوں اور میرے مرقد کی تعمیر آپؐ ہی کی دیوار کے سایہ میں ہو تاکہ میرے بیتاب دل کو سکون اور میری روح کو اطمینان نصیب

ؓ سلطانِ حجاز عبدالعزیز ابن سعود

ہو سکے اور میں فلکِ پیر سے کہہ سکوں کہ میرے آرام و آسائش کو دیکھ، میرا آغاز تو تو نے دیکھا تھا، اب میرے انجام کو بھی دیکھ — !!!

شرم از اظہارِ او آید مرا — شفقتِ تو جرأت افزاید مرا
ہست شانِ رحمتت گیتی نواز — آرزو دارم کہ میرم در حجاز
"مسکنِ یار است و شہر شاہِ من — پیشِ عاشق ایں بود حب الوطن"
کوکبم را دیدۂ بیدار بخش — مرقدے در سایۂ دیوار بخش
تا بیاساید دلِ بیتابِ من — بستگی پیدا کند سیمابِ من
با فلک گویم کہ آرامم نگر
دیدۂ آغازم انجامم نگر

اقبالؒ اور تہذیبِ عصرِ حاضر[1]

---

[1] سید واجد رضوی کی یہ تقریر یومِ اقبالؒ کے موقع پر سینٹ ہال پنجاب یونیورسٹی میں کی گئی۔

عصرِ حاضر قبل از اسلام کے تاریک دور سے ہرگز مختلف نہیں ہے، اُس کی تہذیب ظلمتوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کی ثقافت روح اور اخلاق کے لئے تباہ کن ہے، لیکن دُنیا کے اسلام انہی تاریکیوں میں گھرتی جارہی ہے۔ ہمارے خیالات ونظریات، عادات و روایات، فنون وادب، ہمارا نظامِ قانون، ہماری ننگِ اسلام ثقافتی سرگرمیاں مغربی جہالت کے خوفناک اندھیروں میں ڈوبتی جارہی ہیں۔!

اقبالؒ اور تہذیبِ عصرِ حاضر

علامہ اقبالؒ کے سامنے زندگی کے چند مشن تھے۔ ان میں ایک یہ بھی تھا کہ کہ عصرِ حاضر کی تہذیب یعنی تہذیبِ فرنگ کے نقصانات کا اندازہ کیا جائے اور اس کے زہریلے اثرات سے ساری نوعِ انسان کو آگاہ کیا جائے۔ اس مشن کو انھوں نے بڑی اہمیت دی ہے۔ اور تہذیبِ فرنگ کی تباہ کاریوں کو نمایاں کرنے کے لئے اپنی ساری صلاحیتوں سے کام لیا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تہذیب فرنگ تو بظاہر، دور سے دیکھنے والوں کے لئے بہت دلآویز ہے بلکہ فردوسِ نظر ہے۔ اُس کے ظاہر میں جلوہ ہی جلوہ ہے۔ اور مادی زندگی میں بڑی چمک دمک دکھائی دیتی ہے تو پھر اقبالؒ اُسے کیوں ناپسند کرتے ہیں؟ اس کے متعلق وہ خود فرماتے ہیں کہ تہذیبِ فرنگ نے انسان کو گمراہ کر دیا ہے، اُس کی تمام روحانی اور اخلاقی قدروں کو جلا کر راکھ کر دیا ہے اور ایمان و یقین کو کو کمزور کر کے نفس اور عقل کے تابع کر دیا ہے۔!

می شناسی چیست تہذیبِ فرنگ　　در جہان او دو صد فردوسِ رنگ
جلوہ ہایش خانما نہا سوختہ　　شاخ و برگ و آشیانہا سوختہ

ظاہرش تابندہ و گیرندہ ایست — دل ضعیف است و نگہ رابندہ ایست

اس تہذیب سے اقبال کی بیزاری ٹھوس حقائق پر مبنی ہے۔ اس کو عُریانی میں دیکھا جائے تو نہایت بھیانک اور کریہہ المنظر معلوم ہو گی اور اُس کے جسم کی رگ رگ میں قدیم یونانی نظریات کا زہر رچا ہوا دکھائی دے گا۔ ان نظریات کی رُو سے ایک "مکمل" سوسائٹی صرف عقل ہی کی بنیاد پر قائم ہو سکتی ہے یعنی خرد ہر بات کا پیمانہ ہے، جو بات سمجھ میں آئے درست ہے جو بات ہماری محدود سمجھ میں نہ آئے غلط ہے۔ اور انسان کے لئے فوق الفطرت کی رہنمائی یا وحی کی ضرورت نہیں ہے۔ نیز ان نظریات کے مطابق سوسائٹی میں افزائشِ حسن کے لئے عُریانی اور بے حیائی کا رواج ضروری ہے کیونکہ یونانی فلسفیوں کے نزدیک حُسن کا کمال انسان کا اور بالخصوص عورت کا برہنہ جسم ہے! اور اس کی عام نمائش ہونی چاہیئے۔ چنانچہ سقراط کہتا ہے کہ سطر پوشی سے برہنگی بہتر ہے۔ اس میں شرم کی بات بھی کیا ہے؛ شرم و حیا کا احساس اکتسابی ہے اور بہت جلد کافور ہو سکتا ہے! نیز وہ کہتا ہے کہ عورتیں سب کے لئے مشترک ہونی چاہئیں اور خانگی بیوی اور گھر و خاندان کے تصوّر ہی کو مٹا دینا چاہیئے! یہ نظر یونانِ قدیم میں پروان چڑھتے گئے۔ اور تمام فنونِ لطیفہ میں، سنگ تراشی اور مصوّری میں، تعمیر اور موسیقی میں، ادب اور شاعری میں انسان کے برہنہ جسم اور حیوانی جذبات کی نمائش ہونے لگی اور سقراط کی پیروی کرنے والے اس حقیقت ابدی کو بھول گئے کہ لطافت اور خونِ جگر سے فن معجزہ بن جاتا ہے لیکن کثافت اور حیوانیت سے فن کی حیثیت محض جادوگری کی سی رہ جاتی ہے۔!

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

اور پھر عملی زندگی میں بھی سب کچھ وہی ہوتا رہا جو ان نظریات میں موجود تھا۔ چنانچہ جسمانی تربیت کے اکھاڑوں میں، کھیل کے میدانوں میں، سیر گاہوں اور تماشہ گاہوں میں عورتیں اور مرد مادر زاد ننگے نظر آنے لگے اور یونانی معاشرہ بے حیائی کی انتہائی پستی تک جا پہنچا۔!

اس کے بعد تاریخ کے دوسرے اور تیسرے دور میں یعنی رومیوں کے اقتدار کے زمانہ میں اور چرچ کی بالادستی کے عہد میں یہ نظریات بڑی حد تک مغلوب رہے۔ لیکن پندرھویں صدی عیسوی میں نشاۃ ثانیہ کے ساتھ ساتھ ان نظریات کو بھی تازہ کیا گیا اور ان میں تیزی سے شدّت پیدا کی جا نے لگی۔ کہا جاتا ہے کہ کریلا اور نیم چڑھا۔ اسی کے مصداق قدیم یونانی تہذیب کے کریلوں کی یہ بیل نیم چڑھنے لگی۔ بلکہ یوں کہئے کہ یکے بعد دیگرے نیم کے کئی درختوں پر پھیل گئی اور بالآخر تہذیبِ عصر حاضر کی شکل اختیار کر گئی ——— ! پندرھویں صدی میں میکیا ویلی نے یورپ کو طاقت، سازش اور فریب کی تعلیم دی اور اس تہذیب نے وحشت و بربریت، عیاری اور مکاری کی روح کو اپنے اندر جذب کیا۔ پھر سائنسی انقلاب آیا۔ اور اس زمانہ کے سائنسدانوں نے بدمست ہو کر خدا کے وجود پر نکتہ چینی شروع کی۔ ڈسکارٹس نے اس کے وجود ہی سے انکار کر دیا۔ والیٹر نے اُسے گھڑی ساز سے تشبیہ دیکر اُس کا مذاق اڑایا اور روسو نے اخلاق کو مذہب اور وحی کی رہنمائی

سے بے نیاز کر کے سائنس اور ریاضی کی بنیادوں پر قائم کرنا چاہا۔ نیز ان سب کے قدیم یونانی نظریات کے مطابق یہ قرار دیا کہ ہر بات کی کسوٹی مادی ترقی اور جسمانی عشرت ہے اور ان کا حاصل کرنا خواہ کسی طرح ہو، جائز ہے۔ چنانچہ سقراط کے ان جانشینوں نے کہا کہ مرد اور عورت کے باہمی تعلق میں عصمت اور پاکیزگی کا تصوّر ایک بیہودہ بات ہے۔! پھر انیسویں صدی میں ڈاروِن نے اِس تہذیب پر نظریۂ ارتقاء کو مسلط کر دیا۔ اس نے کہا کہ انسان کا جدِ اعلیٰ بندر تھا اور انسان کی موجودہ شکل مسلسل ارتقاء کا نتیجہ ہے، دُنیا کی ہر چیز تغیّر پذیر ہے۔ اخلاق بھی محض اضافی ہیں۔ حتّٰی کہ حق اور صداقت بھی قطعی نہیں ہیں۔ اور الہام اور وحی کی متعیّن کردہ قدریں جمود اور زوال کی طرف لے جاتی ہیں۔ اس کے بعد فرائڈ منظرِ عام پر آیا۔ اُس نے دعویٰ کیا کہ دنیا میں سب کچھ جنس ہی ہے۔ وہی فوقیت رکھتی ہے۔ اور کسی اخلاق، رواج یا قانون کو جنس (sex) کی بالادستی پر اثر انداز نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے بعد کارل مارکس کی باری آئی۔ اُس نے اعلان کیا کہ انسانی تاریخ، معاشرت اور تمدّن کا ہر پہلو معاشیات کا نتیجہ ہے۔ اِس لئے انسانی زندگی کا مقصد صرف مادی ترقی ہونا چاہیئے اور اِس سلسلہ میں خاندان کے ادارہ کو اُڑا دینا چاہیے! آخر میں شوپنہار نے مادہ پرستی کے اس فلسفہ کو آخری منزل تک پہنچایا۔ اور تہذیبِ مغرب میں اپنے اس تصوّر کو سمو دیا کہ زندگی ایک اندھی رَو ہے، وہ قطعی بے شعور طاقت ہے۔ اُس میں اضطراب ہے۔ لیکن کوئی مقصد اس کے سامنے نہیں ہے۔!

اِن تصورات سے جب قدیم یونانی نظریات کی آبیاری ہوئی تو تہذیب عصر حاضر معرضِ وجود میں آگئی۔ اور مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے اُس کے چند نمایاں اجزائے ترکیبی ہیں۔ ایک تو خرد کی بالادستی ہے۔ یعنی انسانی زندگی اور کائنات کی ہر بات کے لئے عقل ہی ایک کسوٹی ہے۔ دوسرے الحاد، لادینیت اور خدا کے وجود سے انکار ہے، تیسرا جزو کثرتِ دولت، جلب منفعت اور سرمایہ داری ہے۔ اور عریانی، بے حیائی اور مرد اور عورت کے بے روک ٹوک اختلاط کی آزادی چوتھا جزو ہے۔ اِن اجزاء کے تانے بانے سے جو تہذیب تشکیل پائی ہے اُس کا نصب العین فطری طور پر صرف مادی خوشحالی اور جسمانی عشرت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔؟!

انہی انسانیت سوز عناصر کے مدِّ نظر اقبالؒ نے تہذیبِ فرنگ کی مخالفت کی ہے اور فرمایا ہے کہ اس نے زندوں کو مُردہ اور مُردوں کو مُردہ تر کر دیا ہے اور اس کی ساری رنگینیاں جو نگاہ کو خیرہ کرتی ہیں اہلِ بصیرت کے لئے محض باعثِ عبرت ہیں۔

دلئے بر دستورِ جمہورِ فرنگ — مُردہ تر شد مُردہ از صُورِ فرنگ
گرچہ دارد شیوہائے رنگ رنگ — من بجز عبرت نگیرم از فرنگ

اِس میں کوئی شک نہیں کہ زندگی کی تکمیل اور حیات کے ارتقا کے لئے عقل ایک اعلیٰ درجہ کا وسیلہ ہے اور تسخیرِ فطرت اِس کے بغیر ممکن نہیں ہے اسی سبب سے قرآن نے جہاں بار بار تسخیرِ فطرت کی دعوت دی ہے وہاں بار بار عقل سے کام لینے اور سوچنے کی بھی تاکید فرمائی ہے۔ لیکن زندگی

مادی دُنیا تک ہی محدود نہیں ہے۔ اس کے بعد بھی ایک دنیا ہے۔ جس کو عقل کے ذریعے نہیں سمجھا جا سکتا۔ نیز ہماری اِس دنیوی زندگی کا بھی ایک اخلاقی اور روحانی پہلو ہے۔ اس کو سمجھنا اور ترقی دینا بجائے خود اس زندگی میں ہماری بہبودی کے لئے اور مسخر کردہ فطرت کی طاقتوں کے صحیح اور صحتمند استعمال کے لئے ضروری ہے۔ اِس غرض کے لئے وحی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اسی وجہ سے جہاں مادی اور دنیوی امور میں اسلام نے جہاں افلا تعقلون، افلا یتفکرون، افلا یتدبرون کہا ہے، یعنی عقل سے کام کیوں نہیں لیتے، فکر اور تدبّر کیوں نہیں کرتے، وہاں امورِ آخرت اور معاملاتِ روحانی و اخلاقی کے لئے یومنون بالغیب، غیب پر ایمان کی تلقین فرمائی ہے۔ اس تعلیم سے ایک طرف عقل کی تخریبی کارگزاریوں پر پابندی عائد ہوتی ہے جو کہ بالعموم محسوس پرست اور ہوس پرست ہو جاتی ہے اور انسانی نفس کی غلام ہو جاتی ہے تو دوسری طرف مسخر کردہ فطرت کی طاقتوں کے صحیح استعمال کی مکمّل ضمانت بھی ہو جاتی ہے۔

لیکن مغربی تہذیب پر مجرّد عقلیت سوار ہے۔ مادی ترقی کے جنون نے اُسے مغلوب کر رکھا ہے۔ وہاں فطرت کی طاقتوں پر غلبہ حاصل کیا گیا ہے لیکن اُن کو صرف مادّی ترقی، ہوسناکی اور عیش و عشرت کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے

وہاں نشۂ طاقت میں یہ سمجھا جا رہا ہے کہ عالمِ مادی یا عالمِ محسوسات ہی سب کچھ ہے۔ اس سے باہر کوئی چیز نہیں ہے اور روح کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جس کی صراحت مولانا رومی نے فرمائی ہے کہ علم ایک اندھی قوّت ہے۔ اُسے روحانی حکمت اور وحی کی ہدایت نصیب ہو تو انسان کے لئے رحمت بن جاتا ہے۔ ورنہ صرف نفس اور عقل کے زیرِ اثر اولادِ آدم کو سانپ کی طرح ڈسنے لگتا ہے۔

علم را بر تن زنی مارے شود
علم را بر جان زنی یارے شود

لیکن فرنگ نے روحانیّت سے بے نیاز ہو کر علم سے فیض حاصل کرنا چاہا۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ظاہری شان و شوکت تو بہت پیدا ہوئی ہے لیکن انسان کی اعلیٰ اور پاکیزہ قدروں یعنی ہمدردی، مساوات، اخوت، اور عصمت کے تصوّرات کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ ایک طرف اہلِ مغرب نے بنی نوعِ انسان کے ایک بڑے حصّے کو غلام بنا لیا ہے تو دوسری طرف وہ آپس میں بار بار ایسا ٹکرائے ہیں کہ خدا کی اس زمین میں زلزلے پڑ گئے۔ اور آج بھی مادہ اندر ہی اندر پکتا جا رہا ہے اور اُس وقت اور اس مقام کا تعیّن مشکل معلوم ہوتا ہے جبکہ یہ آتش فشاں پھوٹ پڑے گا اور اپنے جلتے ہوئے لاوے کے سیلاب میں ساری نوعِ انسان کو بہا لے جائے گا!

وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اُسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اُس کا آشیانہ

اِن حالات میں مغربی تہذیب کی بڑی نازک صورتِ حال ہو گئی ہے۔ اقبالؒ کہتے ہیں کہ اُس کی بنیادیں کمزور تر ہوتی جا رہی ہیں اور ان بنیادوں پر جو شیشے کی عمارات تعمیر ہو رہی ہے وہ انسان کے لئے عذاب بننے والی ہے کیونکہ ایک ہی دھماکہ سے وہ ریزہ ریزہ، پاش پاش ہو سکتی ہے —!

پیرِ میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوانِ فرنگ
سُست بنیاد بھی ہے، آئینہ دیوار بھی ہے

مغرب نے یقیناً بڑی مادی ترقی کی ہے۔ اور بلاشبہ سائنس کی ترقی نے عظیم الشان کارخانوں کو جنم دیا ہے۔ لیکن یہ کارخانے بے درد سرمایہ داروں کے ہاتھ میں آ گئے، جس کے سامنے نوعِ انسان کی خدمت یا محبت کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ ان کا ہر مزدور ایک جدید غلامی میں پھنس گیا ہے۔ ایک بے پناہ مشین کا پرزہ بن کے رہ گیا ہے۔ دوسری طرف سرمایہ داروں کے سامنے ناقابلِ یقین انسانوی دولت کے ڈھیر لگ گئے۔ لیکن اُن کے ہاں نفس کی تربیت اور جذبات کی تطہیر کا کوئی نظام موجود نہیں ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کثرتِ دولت کے باعث ساری اخلاقی پابندیاں کمزور سے کمزور تر ہو گئیں۔ اسلام کا دعویٰ ہے کہ کثرتِ دولت کی طبیعت میں عیاشی اور فحاشی کو رکھ دیا گیا ہے۔ یعنی تزکیۂ نفس کے ذریعے کثرتِ دولت کی اس طبیعت کو قابو میں نہ رکھا جائے تو دولت کی فراوانی ہمیشہ بے راہ روی اور گناہ کو جنم دیتی ہے۔ اسی اصول کے مطابق مغرب میں انسان کی معاشی کامیابیاں اس کے لئے سکون و راحت کا سامان فراہم کرنے کی بجائے انتشار اور محرومی

کا پیغام بن کر رہ گئی ہیں۔ وہاں عقل بھی رسوا ہو چکی ہے۔ دین بھی خوار ہو گیا ہے۔ محبت اور انسانیت کا جوہر زنگ آلود ہو گیا ہے اور وہاں کے سرمایہ دار اور سائنسدان جو ایٹمی ہتھیاروں کے ڈھیر لگائے جا رہے ہیں اولاد آدم کے لئے فرعون اور چنگیز بن گئے ہیں۔

عقل و دیں از کافری ہائے تو خوار　　　عشق از سوداگری ہائے تو خوار

حکمتے کو عقدۂ اشیاء کشاد

با تو غیر از فکرِ چنگیزی نداد

اس فکرِ چنگیزی نے عجیب تخریبی ذہن کی تخلیق کی ہے اور اِس ذہن نے کہیں ڈکٹیٹر پیدا کیا اور قومی انسانوں کی پرستش کی تعلیم دی، کہیں قوم پرست بن کر اُس نے قومیت اور وطنیت کی تبلیغ کی اور لادینی مملکت کی غیر مشروط وفاداری کی تعلیم دی اور اس طرح قوموں میں باہمی نفرت اور دشمنی پیدا کر کے سخت خونریز جنگوں کا باعث ہوا۔ پھر اُس نے فلسفی اور مصلح کا لبادہ اوڑھ لیا اور ایک طرف گھریلو زندگی اور خاندان کے ادارہ کی جڑیں کھوکھلی کر دیں تو دوسری طرف آزادیٔ نسواں کا پر فریب نعرہ لگا کر سارے انسانی معاشرے کی ساری بنیادوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ——!

اِس نعرہ کی بدولت تہذیب عصرِ حاضر نے عورت کو امومت اور نسلوں کی تعمیر و تربیت کے مقدس منصب سے محروم کر دیا جو فطرت نے اُس کے ذمہ کیا تھا۔ اور کمال یہ ہے کہ عورت کو محرومی اور زیاں کا احساس بھی نہیں ہونے دیا۔ اس کی وجہ پھر وہی ہے کہ دولت کی افراط جب ہو گی اور اخلاقی تحدید باقی نہیں رہی تو زندگی کے ہر شعبہ میں جنسی تعیش کی مانگ بڑھتی گئی۔ لہٰذا

ہر وقت اور ہر مقام پر، بازاروں اور دوکانوں میں، دفتروں اور کارخانوں میں تعلیمی اداروں اور کھیل کے میدانوں میں، ٹیلی ویژن اور ریڈیو سٹیشنوں میں، سیر گاہوں اور ہسپتالوں میں، ٹرینوں اور ہوائی جہازوں میں، غرض کہ زمین میں اور آسمانوں میں جنسی ہوس کی تسکین کا سامان فراہم کیا جانے لگا۔ اس غرض کے لئے عورت کو بڑے سبز باغ دکھائے گئے۔ اُس کو ورغلایا گیا۔ جھوٹی قدریں اُس کے سامنے رکھدی گئیں۔ کہا گیا اور یقین دلایا گیا کہ عورت کا فطری کردار توہین آمیز ہے اس کردار سے حُسن پامال ہوتا ہے۔ جسم کے خطوط بگڑ جاتے ہیں۔ لہٰذا ماں کا رول قابلِ نفرت ہے۔ اس کے برعکس عیاشی کی محفلوں کی رونق بننا اس کا منصب ہے، کال گرل اور ماڈل گرل بننا اُس کا کمال ہے۔ عُریانی اُس کا حُسن، بے حیائی اُس کا زیور ہے اور فحاشی ہی مرد کی غلامی سے نجات کا واحد ذریعہ ہے۔

مغرب کی عورتیں بھی اِس چکر میں آگئیں۔ اُنھوں نے سوچا کہ عُریانی سے سرمایہ دار کو مسحور اور مغلوب کر لیا جائے گا۔ سرمایہ دار حُسن و رعنائی کے اسیر ہو جائیں گے۔ لیکن اُن کے اندازے غلط نکلے اُن کی عقل پر پردے پڑ گئے دل بے گداز ہو گئے۔ اور یہ عورتیں خود دولت کی لونڈیاں بن گئیں۔ اُن کے جسم بک گئے۔ نسائیت تحلیل ہو گئی اور روپے کے لالچ میں اُن کا اصلی حُسن، اُن کی حیا آنکھوں سے جاتی رہی۔!

عقل ہا بیباک و دلہا بے گداز
چشمہا بے شرم و غرق اندر مجاز

اِن حالات میں جنسی بے راہروی مغرب میں عام ہے ، رقابت عام ہے ۔ طلاق زندگی کا معمول ہے ۔ خاندان کا ادارہ دم توڑ رہا ہے ۔ وہاں بچّے والدین پر بوجھ سمجھے جاتے ہیں ۔ اور بڈھے والدین اولاد پر بار تصوّر کئے جاتے ہیں ۔ چنانچہ لڑکی ذرا باشعور ہوتی ہے تو والدین اس کے لئے DATES کا انتظار کرنے لگتے ہیں ۔ اور پھر خوب بنا سنوار کر ہر روز ایک نئے BOY FRIEND کے حوالے کر دیتے ہیں تاکہ کہیں تو ٹھکانے لگے اور اپنے سر سے بلا ٹلے ۔ اسی طرح والدین ضعیفی میں ناکارہ ہوتے ہیں تو اولاد اُنھیں بیت المغدورین میں داخل کر دیتی ہے جہاں زندگی اُن کے لئے ایک المیہ بن جاتی ہے اور آخری لمحات بھی وہ زندگی کے اسی غم میں بسر کر دیتے ہیں ۔ اس اعتبار سے بھی مغرب میں سکونِ قلب مفقود ہو گیا ہے ۔ ذہنی پاکیزگی معدوم ہو گئی ہے اور جدید اعداد و شمار کے مطابق ہر تیسرا مریض یا تو پاگل ہے یا کسی اندوہناک نفسیاتی اُلجھن میں مبتلا ہے ۔!

حیاتِ تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
رقابت ، خود فروشی ، ناشکیبائی ، ہوسناکی

یہ ہے تہذیبِ فرنگ ۔ اور اقبالؒ اُس کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ تہذیب دنیا کے ہر فساد کی جڑ ہے اور اِس میں لاکھوں فتنے پرورش پا رہے ہیں ۔

فتنہ را کہ دو صد فتنہ باآغوشش بود
دخترے ہست کہ در مہدِ فرنگ ہست ہنوز

حکیم الامت فرماتے ہیں کہ مغرب انہی فتنوں کی زد میں آنے والا ہے انہی

فسادات کے سیلاب میں وہ بہہ جانے والا ہے۔ اقبالؒ اُس کی تباہی کو دیکھ رہے تھے۔ اور اہلِ جہان کو آگاہ کر رہے تھے کہ:-

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہگزرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

لیکن اب ہم مغرب کی تقلید کرنا چاہتے ہیں۔ اُس کی تہذیب کو جو قدم قدم پر فتنے جگا رہی ہے اپنانا چاہتے ہیں۔ دراصل یورپ سے نکل کر اس تہذیب کے سیلاب نے ہر ملک کا رُخ کیا اور ایشیا اور افریقہ کی ساری تہذیبوں کو اپنی زد میں لے لیا۔ دوسری طرف مفتوح اور غلام قوموں نے اُس کے سامنے سر جھکا دیا۔ اب وہ احساسِ پستی میں مبتلا ہیں۔ تہذیبِ فرنگ کو تمام سیاسی معاشی اور معاشرتی خرابیوں کا علاج سمجھتی ہیں۔ چنانچہ ہم پاکستانی بھی اسی دھارے میں بہ نکلے ہیں۔ اس کی ابتداء حکیم الامت ہی کی زندگی میں ہوئی تھی۔ اسی سبب سے انھوں نے مغربی تہذیب کی غلامی سے بچنے کی مسلمانوں کو تاکید کی تھی اور فرمایا تھا کہ نقالی سے زندگی بے روح ہو جاتی ہے اور غیروں کی تقلید سے بُلند پایہ لذت پیدا نہیں ہو سکتی۔!

طرفگی ہا در نہادِ کائنات نیست از تقلید تقویمِ حیات

لیکن اب صورتِ حال یہہ ہے کہ ہم میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو قرآن کو سرچشمۂ ہدایت مانتے ہی نہیں۔ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ۔ یہ لوگ تو خارج از بحث ہیں کیونکہ اُمُّ الکتاب ہی کو ناقص سمجھتے ہیں۔

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق،

دوسرے وہ لوگ ہیں جو دین و دنیا کی تقسیم کرتے ہیں اور دنیوی امور میں قرآنی احکام کو معطل کر کے اُن کی جگہ مغربی تہذیب سے روشنی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ آدھا تیتر آدھا بٹیر قسم کے لوگ انگریزی کتابوں میں پڑھتے آئے ہیں کہ مذہب مادی اور سائنسی ترقی کے خلاف ہے اس لئے اُسے صرف چرچ میں مقید رکھا جائے۔ لہٰذا ان بزرگانِ ملت نے سمجھ لیا کہ اسلام بھی ایسا ہی ہوگا۔ اُنھوں نے اس بات کو نوٹ نہیں کیا کہ ان کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے وہ عیسائی مذہب پر صادق آتا ہو تو ہو، اسلام پہ صادق نہیں آتا اُنھوں نے خود بھی قرآن میں جھانک کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ قرآن تسخیر فطرت اور سائنسی ترقی کی طرف ایک مسلسل دعوت ہے اور اس کی رُو سے تسخیر فطرت آدم کی صفت اور اُس کا وظیفہ ہے۔ ان لوگوں کو بھی چھوڑیئے تیسرا گروہ ایک اور بھی ہے۔ اس گروہ کے لوگ قرآن کو جامع اور ہمہ گیر تو مانتے ہیں لیکن مغربی نظریات اور تصوّرات کو اپنا کر اُن پر قرآن کی مہر صداقت لگاتا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اسلام تباہ ہو جائے گا اگر عصرِ جدید کے تقاضوں کے ساتھ سمجھوتہ نہ ہو سکے۔ دراصل شدید احساسِ پستی میں وہ مبتلا ہیں اور مغربی لادینی معاشرہ کے تغیّر پذیر تقاضوں کے ساتھ ہمارے عقیدے اور قرآنی احکام کو بھی بدل دینا چاہتے ہیں اور اسی انہماک میں مغربی معاشرہ اور قرآنی معاشرے کے اساسی اور بنیادی اختلاف اور تضاد ہی کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ غیروں کے نظریات میں گرفتار ہونے کے باوجود خود کو آزاد سمجھتے ہیں ۔۔ حقیقت میں تہذیبِ فرنگ کا کمال یہ ہے کہ اس کے غلاموں کو

غلامی کا احساس بھی باقی نہیں رہتا۔

صد اد آزاد خواند خویش را　　کشتۂ او زندہ داند خویش را

غور کیجئے کہ اسلامی تہذیب اور فرنگی تہذیب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مثلاً مغرب کے برعکس اسلام تمدنی ارتقاء کو خیر و شر کی اصطلاح میں جانچتا ہے مغرب میں ہر قدم جو آگے بڑھی خواہ تباہی اور آگ کے گڑھے کی طرف ہی کیوں نہ ہو "ترقی" کی تعریف میں شامل ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کوئی بات "ترقی" نہیں کہلائی جا سکتی خواہ اس سے کیسی ہی مادی منفعت یا جسمانی راحت حاصل ہو اگر وہ ہماری بنیادی تمدنی قدروں یعنی وحدت، رسالت، اخوت، مساوات، اموت، حیا اور جہاد کے خلاف ہو۔ ایسی ہر بات اسلامی نقطۂ نظر سے ترقی معکوس ہے، جرم ہے گناہ ہے۔ قابلِ نفرت اور قابلِ مذمت ہے!۔ مغرب میں "حق"، اضافی ہے۔ لیکن اسلام میں "حق" انسان کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ ترقی پذیر بھی نہیں ہے۔ زمان و مکان سے محدود بھی نہیں ہے۔ بلکہ وہ خدا کا بنایا ہوا۔ قطعی اور ابدی ہے۔ ڈارون کے نظریہ کے مطابق حضرت آدم نیم بندر تھے۔ برہنہ اور جانوروں کی طرح رہتے تھے۔ اس لئے جو بات ان کے نزدیک "حق" ہو سکتی تھی وہ موجودہ عہد میں "حق"، نہیں ہو سکتی۔ لیکن قرآن کے نزدیک وہ مکمل اور باشعور انسان اور نبی برحق تھے اور اُن کے زمانہ میں جو بات "حق"، تھی آج بھی بدستور "حق" ہے — ! نیز مغربی معاشرہ قومی اقتدارِ اعلیٰ کی بنیاد پر قائم ہے اور الحاد و لادینیت کا علمبردار ہے اور اُس کا نصب العین حصول دولت اور لذتِ نفس ہے۔ لیکن اسلامی معاشرہ

خدا کے اقتدار اعلیٰ کے تصور کی احساس پر قائم ہوتا ہے۔ اور اُس کا نصب العین توحید اور رسالت کی حفاظت اور تبلیغ ہوتا ہے۔ اور اِس غرض کے لیے اسلامی معاشرہ کی تعمیر جن خطوط پر ہوتی ہے اُن کی صراحت حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے اپنے ایک نہایت اہم خطبہ میں کہا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہمارا مقصد معاشرہ میں ذوقِ جہاد اور حیا کو محفوظ اور مستحکم کرنا ہے۔ اِس مقصد کی بےشمار حکمتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ بےحیائی سے انسان کی خودی اور خودداری زائل ہو جاتی ہے اور ایسا معاشرہ شیطانی اور طاغوتی قوتوں کے مقابلہ میں کمزور پڑ کر لطیف اور ارفع نصیب العین کے حصول سے قاصر رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے یونانی فلسفیوں کے برعکس شرم وحیا کو فطری جذبہ قرار دیا ہے اور شرک کے ساتھ ساتھ بےحیائی کو بھی حرام ٹھیرایا ہے قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (۷ : ۳۲) یعنی اے محمدؐ! لوگوں سے کہو کہ میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں ان میں بےشرمی کے کام بھی ہیں! قرآن واضح کرتا ہے کہ شرم انسان کے اندر مصنوعی طور پر پیدا نہیں ہوئی بلکہ یہ فطری چیز ہے جو ابتدا ہی سے انسان کی طبیعت میں ودیعت کی گئی ہے۔ انسانی معاشرہ کی فلاح میں اسے بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ جب کبھی کوئی معاشرہ حیا کے جذبہ کو مجروح کرتا ہے تو وہ سیدھی راہ سے ہٹ جاتا ہے اور خدا کے قہر کا مستوجب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن سے ثابت ہے کہ پہلی چال جو انسان کو مقہور کرنے کے لیے شیطان نے چلی تھی وہ یہ تھی کہ انسان کے جذبۂ شرم وحیا پر ضرب لگائے اور عریانی کے راستے سے فواحش کا دروازہ کھولے اور اس کو صنفی امور میں بدراہ کرے،

یعنی شیطان نے انسان کے مقابلہ میں حملہ کے لئے سب سے زیادہ کمزور مقام جو تلاش کیا وہ اس کی زندگی کا صنفی پہلو تھا۔ اور پہلی ضرب جو اُس نے لگائی وہ اُس محافظ فصیل پر لگا جو شرم و حیا کی شکل میں خالقِ کائنات نے انسانی طبیعت میں رکھی تھی۔ شیطان کے شاگردوں کی یہ روش سقراط سے لیکر تہذیبِ عصرِ حاضر کے علمبرداروں تک بدستور قائم ہے۔!

حضرت عمرؓ بن عبد العزیز نے بھی اپنے ایک پیغام میں اپنے سپہ سالاروں کو تقویٰ برقرار رکھنے کی تاکید کی تھی اور فرمایا تھا کہ ہم بے سروسامان ہیں لیکن تقویٰ بے سروسامانی کی تلافی کرتا ہے اور اسی کی بدولت ہم دشمن پر فتح حاصل کرتے ہیں جو سامانِ حرب اور تعداد کے لحاظ سے ہم سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہمارے۔ اندر تقویٰ باقی نہ رہے تو ہم بھی گناہ میں دشمن کے برابر ہو جائیں گے اور ہارتے ہی چلے جائیں گے۔ گویا کہ حضرت عمرؓ بن عبد العزیز نے اِس ابدی حقیقت کی نقاب کشائی کی ہے کہ:۔

کافر ہو تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی!

اور اِس حقیقت سے تاریخِ عالم بھری پڑی ہے۔ ہم نے ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں سپاہیوں کو بے تیغ بھی لڑتے دیکھا ہے۔ اور جون ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں مغرب کی نقالی کرنے والوں، قومیت کے پرستاروں اور مصلوں پہ راتیں بسر کرنے کی بجائے دریائے نیل کے کنارے کیبروں اور عریاں ناچ گھروں میں زندگی گزارنے والوں کو بیس ارب روپیہ کا سامانِ جنگ چھوڑ کر

بھاگتے ہوئے اور تاریخ کی سب سے زیادہ ذلت آمیز شکست کھاتے ہوئے بھی دیکھا ہے — ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہمارے جن "دوستوں" نے بھارتی سامراج سے حملہ کرایا تھا، اُن کو ایسی ہی توقع تھی کہ ہم بھی محاذ چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ لیکن جنگ کے بعد حالات اور اسباب کا تجزیہ کر کے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ پاکستانی سپاہی اپنی اخلاقی اور روحانی قدروں کی بدولت کامیاب رہے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد ہمارے ان "دوستوں" نے ہماری روحانی اور اخلاقی حالت کو بگاڑنے کا بیڑہ اُٹھا لیا۔ اِس غرض کے لئے وہ بے شمار حربے استعمال کر رہے ہیں — اور آج ہم یہ محسوس کر رہے ہیں کہ پچھلے سو سالوں میں ہماری اخلاقی حالت اس قدر خراب نہیں ہوئی تھی جتنی کہ پچھلے تین، چار سالوں میں ہوئی ہے۔!

بات کہیں اور جا نکلی۔ میں اسلامی اور مغربی تہذیبوں کے تضاد پر گفتگو کر رہا تھا۔ اور عرض کر رہا تھا کہ ہمارے "عقلاء" کے ایک گروہ کو ان دونوں تہذیبوں میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا۔ ان کے نزدیک اگر سود مغرب میں جائز ہے اور مغرب کی اقتصادیات کی بنیاد ہے تو ہمارے ہاں بھی اس کو جائز ہونا چاہیئے۔ بُت تراشی اور نقالی وہاں فن ہیں تو ہمیں بھی اس فن کی اجازت ہونی چاہیئے۔ اور مغرب کی طرح ہمیں بھی آزادیٔ نسواں اور عورت و مرد کی مصنوعی مساوات کا ڈھونگ رچانا چاہیئے — لیکن حکیم الامت کا یہ فیصلہ ہے کہ اسلام عورت اور مرد کی مساوات کو صرف احترام، معاشی حقوق اور آسائش کی اصطلاحوں میں تسلیم کرتا ہے، فرائض اور اس دُنیا میں عملی کردار

کی اصطلاحوں میں تسلیم نہیں کرتا۔ ان میں وہ امتیاز کرتا ہے کہ مرد اور عورت کے مابین زندگی کے شعبے علیحدہ علیحدہ تقسیم کرتا ہے۔ یہ تقسیم منشائے فطرت اور مرد و عورت کی جسمانی و ذہنی ساخت کے عین مطابق ہے۔ ہمارے ہاں عورت کا منصب امومت ہے وہ معاشرہ کو صحتمند نسل عطا کرتی ہے، خاک کو آدم بناتی ہے۔ آتشِ زندگی کی محافظ ہوتی ہے۔ ثابتِ زندگی کا سامان مہیا کرتی ہے۔ وہ ربّ البیت ہوتی ہے۔ تقدّس مآب ہوتی ہے۔ ملّت کی عزت، اس آبرو ہوتی ہے۔ محبّت کی تخلیق کرتی ہے، اخوّت کے جوہر کو اجاگر کرتی ہے۔ اور ان فرائض کی انجام دہی کی بدولت اسلام میں اِس کا مقام بہت بلند ہوتا ہے۔ اوجِ ثریّا سے بھی بلند! اور یہ وہ مقام ہوتا ہے۔ جہاں کہ عورت ملّت کو توانائی بخشتی ہے اور قرآن کی روح بن جاتی ہے —!

حافظِ رمزِ اخوّت مادراں
قوتِ قرآن و ملّت مادراں،

لیکن مغرب میں وہ آدم کو خاک بناتی ہے۔ نائٹ کلبوں اور کیبروں میں برہنہ اور نیم برہنہ رقص میں مصروف رہتی ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں اپنے جسم کو زیادہ سے زیادہ عُریاں کر کے جنسِ مخالف کو اپنی طرف راغب کرنا اپنا کمال سمجھتی ہے۔ اور اسی کو اپنی آزادی تصوّر کرتی ہے! حالانکہ ایسی آزادی حیا کو نذرِ آتش کرتی ہے اور بے شمار فتنوں کو جگاتی ہے۔

شوخ چشم و فتنہ زا آزادیش
از حیا نا آشنا آزادیش

بہرحال ہمارے یہ بزرگ اصرار کرتے ہیں کہ اسلام نے مرد اور عورت کے آزادانہ اختلاط پر ہرگز کوئی پابندی عائد نہیں کی ہے۔ مغرب میں یہ پابندیاں نہیں ہیں۔ اسی لئے تو وہ ترقی کر رہا ہے اور ہم اس دقیانوسی تاویل قرآن پر عمل کریں گے تو پھر ترقی کیسے ہوگی؟ ہسپتالوں میں زخم کیسے مندمل ہوں گے؟ دواؤں میں تاثیر کہاں سے آئے گی؟ سائنسی ایجادات کس طرح ممکن ہو سکیں گی؟ اور دفتروں میں کارکردگی ختم ہو جائے گی۔ ٹائپ رائٹر جواب دے جائیں گے۔ ہوائی جہاز اُڑنا چھوڑ دیں گے کیبرے اور جدید ہوٹلوں سے جو زرِ مبادلہ ہمیں ملتا ہے۔ ہم اُس سے محروم ہو جائیں گے۔ اور معصوم لڑکیوں کے نیم برہنہ "ثقافتی رقص" سے جو روحانی سکون حاصل ہوتا ہے وہ ہمیں کہاں میسر آئیگا؛ اور ایسے رقص کو ترک کریں گے تو اہلِ مغرب کے سامنے اپنے "ترقی یافتہ" ہونے کا اور کیا ثبوت پیش کر سکیں گے۔؟!

اسی سلسلہ میں ہمارے ملک کے ایک بڑے "سکالر" نے کچھ سال ہوئے پاکستان ٹائمز میں ایک مضمون شائع کرایا تھا۔ اُس کا مفہوم یہ ہے کہ جدید تہذیب کی برکات سے مستفید ہونے کے لئے عورت اور مرد کا بے روک ٹوک اختلاط ضروری ہے۔ اور ایسے اختلاط سے "ہر بات" متوقع ہو سکتی ہے جسے روا رکھنا ضروری ہے۔ اِس لئے اگر پاکستان جہالت کی تاریکی سے نکل کر تہذیبِ جدید کی روشنیوں اور برکتوں سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے تو مغربی معاشرہ کی طرح ہمارے معاشرہ میں زناکاری کو جرم اور گناہ کی فہرست سے خارج کر دینا چاہیئے۔ اور اس غرض کے لئے اسلامی احکام کی جدید تعبیر

ہونی چاہیئے ۔ ! کون کہے ان حضرت سے کہ :۔

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر!
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی!

قرآن کے جن احکام کی وہ تاویل کرنا چاہتے ہیں ان کو ملاحظہ فرمائیے۔ سورۃ النور کی پہلی آیت میں تاکیداً فرمایا گیا ہے کہ اس سورہ کے مندرجہ احکام کو فرض کیا گیا ہے تاکہ تم خبردار ہو جاؤ۔

سُورَةٌ اَنزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنزَلْنَا فِيهَا اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ٥

اِس تاکید کے بعد پہلا حکم یہ نافذ ہوتا ہے ۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِي دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ٥

یعنی زانی اور زانیہ ہر ایک کو ایک ایک سو کوڑے مارو اور یاد رکھو کہ رحم کا کوئی جذبہ تمہیں اس حکم کی تعمیل سے باز نہ رکھے اگر اللہ اور روزِ حشر پر تمہارا ایمان ہے۔ اور مومنین کی ایک جماعت اُن کے اِس عذاب کو دیکھے ۔!

اِس قسم کے قطعی اور تاکیدی احکام میں تحقیق کر کے ہمارے مغرب زدہ فرنگی مآب لیڈر خود کو فریب دینا چاہتے ہیں۔ موجِ سراب کو چشمۂ کوثر

سمجھ رہے ہیں۔ اور منشائے خداکے بزرگ کو تبدیل کر کے ہماری بنیادی قدروں ہی کو بدل دینا چاہتے ہیں ـــ ایسے ہی لوگوں کی بدنیتی اور ناعاقبت اندیشی کے متعلق اقبالؒ فرماتے ہیں کہ :۔

ہم مسلمانانِ افرنگی مآب　　چشمۂ کوثر بجویند از سراب

بے خبر سرِ دیں اند ایں ہمہ　　اہلِ کیں اند اہلِ کیں اند ایں ہمہ

ایسے ہی بزرگ کہتے پھرتے ہیں کہ قرآن کی ایسی تعبیر ہونی چاہیئے کہ وہ ہمارے دِل و دماغ کو اپیل کر سکے !۔ لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ اگر اسلامی تعلیم میں موجودہ مسائل کا حل ہمیں نظر نہیں آتا اور یہ تعلیم ہمارے دِل و دماغ کو اپیل نہیں کرتی تو اس میں نہ اِس تعلیم کا کوئی قصور ہے اور نہ ہمارا کوئی قصور ہے۔ جس انداز سے اور جن خطوط پر ہماری ذہنی تربیت ہو رہی ہے اُن کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہم اسلام اور مذہب سے دُور ہی ہٹتے چلے جائیں ذرا غور کیجئے کہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں کم از کم اٹھارہ گھنٹے فلمی نغمے جن میں بالعموم جنسی ہیجان پیشِ نظر ہوتا ہے اور ایک جسم دوسرے جسم کو ملاپ کی دعوت دیتا رہتا ہے، فضاؤں میں گونجتے رہتے ہیں۔ بچّہ جب پیدا ہوتا ہے تو بانگِ اذان سے پہلے ان نغموں کی لے اس کے کان میں پڑتی ہے۔ پھر زندگی بھر معاشرہ کے ہر شعبہ میں ایسی کیفیّت وہ محسوس کرتا ہے کہ جس میں قدم قدم فرشتوں کے پائے ثبات میں بھی لغزش آسکتی ہے ـ! اور جب آج کا آدمی مرتا ہے اور اُس کی نعش اُٹھائی جاتی ہے تو کہیں نہ کہیں سے پھر وہی لتا کی سی آوازیں اُس کے کان میں پڑنے لگتی ہیں ـ! اور اس

طرح پیدائش سے موت تک، مہد سے لحد تک آج کا انسان حیوانی اور نفسانی خواہشات کے ہیجان اور عریانی اور بے حیائی کے شدید طوفان میں گھرا رہتا ہے اور ایسے ماحول میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو رہا ہے جس میں روحانی بالیدگی کی تمام راہیں مسدود کی جا رہی ہیں اور بیشمار طاغوتی قوتیں سرگرم عمل ہو گئی ہیں۔!

چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں رُوح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

ان شیطانی قوتوں میں مغرب سے درآمد اور سمگل کیا ہوا فحش لٹریچر بھی ہے ہمارے اندر احساسِ پستی پیدا کرنے والی کتابیں بھی ہیں مشن سکول بھی ہیں۔ حیا سوز ہوٹلیں اور کیبریز بھی ہیں، فلمیں اور نام نہاد "ثقافتی" شو بھی ہیں جن کا آغاز غضبِ خدا کا تلاوتِ کلامِ پاک سے کیا جاتا ہے۔!

حرم نہیں ہے فرنگی کرشمہ سازوں نے — حرم کے تن میں چھپا دی ہے روحِ تبخانہ

آج حکیم الامت زندہ ہوتے تو شاید اس شعر میں ترمیم کرتے اور فرماتے کہ ——!

حرم نہیں ہے ثقافت کے دعویداروں نے — حرم کے تن میں چھپا دی ہے روحِ تبخانہ

اور ان میں ریڈیو بھی ہے اور چشمِ بد دُور ٹیلی ویژن بھی ہے جن کے ہاں دکھاوے کے لیئے مسجد بھی ہے اور پرچار کے لیئے ساقی اور خرابات بھی ہے! غالب کے ہاں مسجد کے زیرِ سایہ خرابات کا وجود تھا۔ لیکن ان کے ہاں مسجد خود زیرِ سایۂ خرابات آ گئی ہے —!! ان حالات میں یہ توقع رکھنا کہ

اسلامی تعلیم جو قدم قدم پر نفس کی بے راہ روی پر بندشیں عائد کرتی ہے ہمیں اپیل کرے گی عبث اور محض بے سود ہے کیونکہ :-

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بند م کردہ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہوشیار باش!

عصر حاضر کی اِن ہی فتنہ انگیزیوں کو اقبال نے محسوس کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ نسلِ انسانی کو اس نے آفتوں اور مصیبتوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ تو مواہ کے نظام کو درہم برہم کر دیا ہے۔ شاخسارِ زندگی اُسی کے باعث بے نم ہے۔ اسی کے سبب سے ہم اپنے آپ سے بیگانے ہو گئے ہیں۔ ہمارے ساز اپنی آواز سے محروم ہیں۔ ہمارے ضمیر کو مُردہ کر دیا گیا۔ اور ہمارے دل میں ایمان کی ہر چنگاری کو بجھا دیا گیا ہے۔!

عہدِ حاضر فتنہ ہا زیرِ سر است | طبع نا پروائے او آفت گر است
جلوہ اش ما را ز ما بیگانہ کرد، | سازِ ما را از نوا بیگانہ کرد،
از دلِ ما آتشِ دیرینہ بُرد، | نور و نارِ لا الٰہ از سینہ بُرد!

کہا جاتا ہے کہ سائنسی اور صنعتی ترقی کی وجہ سے انسان کے سامنے نئے نئے مسائل پیدا ہوتے جا رہے ہیں، اس لئے اسلامی تعلیمات میں "ریسرچ" کر کے ایسی تعبیر کی جائے جو جدید معاشرہ کی ضروریات کو پورا کر سکے، بات تو بظاہر بڑی معقول معلوم ہوتی ہے بشرطیکہ ایسے "ریسرچ" سے قرآن کے بنیادی اور صریح احکام میں ردّ و بدل نہ ہوتا ہو۔ دیانتداری سے غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ سائنسی اور صنعتی ترقی کی بدولت جو بھی مسائل پیدا ہو رہے ہیں ان سب کا

حل کتاب اور سنّت میں موجود ہے اور جدید سیاست معیشت اور معاشرت کو بڑی آسانی سے اسلامی احکام کے تابع کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ ریسرچ کا ذکر کرتے ہیں ان کی مُراد یہ ہوتی ہے کہ مغربی افکار کی سند قرآن و سنّت سے حاصل کی جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب نے اپنے ایک خیال آفرین مضمون میں جو چند سال قبل پاکستان ٹائمز میں شائع ہوا ہے بر وقت ملّت کی توجہ اُس فتنہ کی طرف مبذول کرائی ہے جو "ریسرچ" کے نام سے سر اُٹھا رہا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہماری ریسرچ کی خواہش اسلام سے محبّت کی بدولت نہیں ہے بلکہ مخفی نفرت اور مغربی نظریات سے لگاؤ اور مرعوبیّت کا نتیجہ ہے ــــ!

اگرچہ اجتہاد کے دروازے اسلام نے کھُلے چھوڑے ہیں لیکن اس کے لئے بڑی سخت شرطیں بھی عائد کی ہیں تاکہ چھُپے ہوئے دشمنوں اور انتشار انگیز قوتوں کو دین کی جڑیں کھوکھلی کرنے اور ملّت کا شیرازہ بکھرنے کا موقع نہ مل سکے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ اجتہاد قرآن اور سنّت کے کسی واضح حکم کے خلاف نہ ہو۔ دوسرے، اس پر سارے علمائے دین متفق ہوں۔ اور جو علمائے دین رائے ظاہر کریں ان کا کردار نہایت پاکیزہ اور بے لوث ہو اور ان کے تقویٰ اور علمی بصیرت میں کسی شبہ کی گنجائش نہ ہو ــــ! اقبال کہتے ہیں کہ قرآن ایک زندہ جاوید اور لازوال کتاب ہے۔ نوعِ انسان کے لیے آخری اور قطعی پیغام ہے۔ اُس کے کسی حرف پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اُس کا ایک حرف بھی تبدیل نہیں ہو سکتا اور اُس کی کوئی آیت تعبیر کی محتاج نہیں ہو سکتی ــــ!

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم　　　حکمتِ او لازوال است و قدیم

حرفِ اور اربِ تبدیل نے آیہ اشِ شرمندۂ تاویل نے!

اگر یہ شرطیں پوری نہ ہوتی ہوں، زمانہ فساد اور انتشار سے معمور ہو اور اجتہاد کا مقصد اسلام کو دیگر نظریات سے مغلوب کرنا ہو تو اقبال کے نزدیک اجتہاد کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عالمانِ کم نظر کے ریسرچ سے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنا بہتر ہے کیونکہ ہمارے اجداد کی عقل، جنہوں نے اسلامی تعلیمات کی تعبیر فرمائی ہے۔ ہوس اور گناہ سے فرسودہ نہیں ہوئی تھی۔

اجتہاد اندر زمانِ انحطاط قوم را برہم ہمی پیچیدہ بساط
ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر اقتدا بر رفتگان محفوظ تر

اقبالؒ کے نزدیک صحتمند اجتہاد تہذیبِ فرنگ کی نقالی میں مضمر نہیں ہے۔ بلاشبہ ہم وہ سارے علوم جو ہماری بنیادی قدروں سے متصادم نہیں ہوتے یا جن کے حاصل کرنے میں ہماری بنیادی قدریں مجروح نہیں ہوتیں، مغرب سے یا چین سے حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن علوم کو اہمیت دینے سے پہلے ہم مغربی ثقافت اور ظواہر کی تقلید پر اُتر آتے ہیں۔ حالانکہ مغرب کی ترقی کا راز اُس کی ظاہری تہذیب اور چنگ و رباب میں نہیں ہے۔ نہ عورتوں کی عُریانی اور رقصِ بے حجاب میں ہے۔ اُس کی قوت لادینی نظریات میں بھی نہیں ہے اور نہ مخصوص لباس اور وضع قطع میں ہے۔ بلکہ اس کی قوت کا راز سائنسی علم اور ٹکنالوجی میں ہے۔ اسی کی بدولت وہ کائنات کی قوتوں کو مسخر کرتا جا رہا ہے۔ اور اسی سے اُس کی شمع روشن ہے۔!

قوتِ مغرب نہ از چنگ ورباب — نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب
نے زسحرِ ساحرانِ لالہ روست — نے زعریاں ساق و نے از قطع مو ست
محکمی او را نہ از لا دینی است — نے فروغش از خطِ لاطینی است
قوتِ افرنگ از علم و فن است — از ہمیں آتش چراغش روشن است

اس لئے اقبالؒ ایسی تجدید کے حامی ہیں جس کا نقالی سے کوئی تعلق نہ ہو بلکہ جس میں روح خود ارتقاء کے لئے مناسب قالب اختیار کرے۔ اُن کے نزدیک محض بدّت آفرینی زندگی کا ثبوت نہیں ہے۔ باطل کے ساتھ حق کا کوئی سمجھوتہ ترقی کے مترادف نہیں ہے۔ بلکہ حقیقی ترقی اور سچّی تعمیر قرآن کی بنیادوں ہی پر ہو سکتی ہے۔ ان بنیادوں کو بدستور قائم رکھا جائے تو بھی بنیادیں تغیرّ حالات کے ساتھ عروج کی نئی راہیں سمجھا سکتی ہیں کیونکہ قرآن کی تعلیم میں ہماری تہذیب کے بے شمار ارتقائی مدارج کے لئے اساسی عناصر موجود ہیں — !

صد جہانِ تازہ در آیات اوست — عصرہا پیچیدہ در آنات اوست
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است — گیر اگر در سینہ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خدا است — ہر جہاں اندر بر او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانِ در برش — می دہد قرآں جہانے دیگرش

لہٰذا اقبال کو نقالی پر افسوس ہوتا ہے۔ اُن کو اس بات کا بھی ملال ہے کہ مصطفیٰ کمال سعید حلیم پاشا کے بتائے ہوئے راستہ پر نہ چلا اور صرف نقلِ فرنگ قانع ہو گیا۔ اُس نے جوشِ تقلیدِ فرنگ میں قرآن ہی کو بالائے

طاق رکھدیا۔ اور پھر رضا شاہ نے چاہا کہ مجتہدینِ ایران سے چھٹکارا حاصل کرے اور ایرانیوں کو "مہذب" ملت میں تبدیل کر دے۔ حال میں افغانستان کا ظاہر شاہ بھی اُنہی کے نقشِ قدم پر روانہ ہوگیا۔ لیکن یہ سب مغرب کے ظاہر کی تقلید میں پڑ گئے اور آج ہمارے عقلاء بھی ان ہی کی پیروی کو اپنا شعار بنانا چاہتے ہیں۔ افسوس اِس امر کا ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی کوشش نہیں کی کہ قرآنی اساس پر خالص اسلامی تہذیب کو فروغ دیا جائے جو دنیا کی ہر تہذیب سے فائق اور برتر ہو —!

نہ مصطفیٰؐ نہ رضا شاہ میں ہے اُس کی نمود
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

مختصر یہ کہ اقبالؒ کے خیال میں مسلمان نقالی اور زمانہ سازی سے نہیں بلکہ زمانہ ستیزی سے طاقتور ہو سکتا ہے۔ مسلمان حالات کا مرکب نہیں بلکہ راکب ہے اس لیے تہذیبِ عصرِ حاضر کی پیروی ہماری توہین ہے اور اُس دستورِ عظیم کی تحقیر ہے جس کے نفاذ کے لئے ہم نے یہ ملک بنایا ہے۔ غور کیجئے کہ عصرِ حاضر قبل از اسلام کے تاریک دور سے ہرگز مختلف نہیں ہے۔ اس کی تہذیب ظلمتوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اُس کی ثقافت روح اور اخلاق کے لیے تباہ کن ہے۔ لیکن دُنیائے اِسلام انہی تاریکیوں میں گھرتی جارہی ہے۔ ہمارے عقائد و نظریات، عادات و روایات، فنون و ادب، ہمارا نظامِ قانون، ہماری ننگِ اسلام جدید ثقافتی سرگرمیاں مغربی جہالت کے خوفناک اندھیروں میں ڈوبتی جارہی ہیں۔ اور اگر ہم ایک طاقتور اور خود دار

ملّت کی حیثیّت سے زندہ رہنا چاہتے ہیں، اگر ہمیں اسلام کی بقا منظور ہے۔ اُن قدروں کی تنظیم مقصود ہے جس کے لیئے یہ ملک بنایا گیا ہے اور جن کی خاطر ہندوستان کے طول وعرض میں مسلمان آج تک اپنا خون بہا رہے ہیں۔ تو پھر ہمیں مضبوط قدم اُٹھانے کی ضرورت ہے۔ اور اس غرض کے لئے ہمارے اربابِ اقتدار کو ذہنی، تعلیمی اور معاشرتی انقلاب لانے کی ضرورت ہے۔ محض اصلاح وتعمیر کی گفتگو کافی نہیں ہے۔ کیونکہ آج ہمارے درمیان شیطان آزاد کر دیا گیا ہے اور ہمارے ذہنوں سے خدائے ذوالجلال کے تصوّر کو مٹایا جا رہا ہے —!

اہرمن اندر جہاں ارزاں و یزداں دیریاب

انقلاب!

انقلاب اے انقلاب!!